سیکولر لابی، تاریخ اور
اورنگزیب عالمگیر
طارق جان

سیکولرلابی، تاریخ اور اورنگزیب عالمگیر

اُن کے ماخذوں کا تنقیدی جائزہ

محمد اورنگ زیب عالمگیرؒ (۱۶۱۸-۱۷۰۷) کے وجود اور کردار پر ہندو اور مغربی مؤرخین ایک عرصے سے حملہ آور ہیں۔ خود مسلم معاشرے کے اندر سے یہ وار اُن سیکولر حضرات (زنادقہ) کی طرف سے ہوا ہے، جن کے نام مسلمانوں ہی کے سے ہیں۔ ان کے دانش ورانہ فتوے کے مطابق اورنگ زیب کے کردار کا کمزور ترین پہلو اُس کا اپنے بھائیوں کے خلاف ظالمانہ طرزِ عمل اور اپنے باپ شہاب الدین محمد شاہ جہاں (۱۵۹۳-۱۶۶۶) کو بندِ اسیری میں ڈالنا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ اورنگ زیب کے تین بھائی جان سے گئے، اور والد شاہ جہان آگرہ قلعہ کی تنہائی میں مقید رہے۔ لیکن ان واقعات کو پورے پس منظر سے جُدا کر کے محض منفرد قصے سمجھنا، جیسے وہ

تاریخ کا ایسا کردار ہے کہ جس کے سر پر ظلم و ستم کا بھوت سوار تھا، یا وہ غیر معمولی طور پر ہوسِ اقتدار میں مبتلا تھا، جس کی وجہ سے اُس نے یہ سب کر ڈالا، قطعاً غلط اور بے ثبوت مقدمہ ہے۔ اگر اورنگ زیب کا کردار باقی ہر لحاظ سے اُجلا اور بے داغ تھا تو ہم اس کے دامن پر بظاہر یہ دھبے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ یا اُسے کس بات نے مجبور کیا کہ باپ اور بھائیوں کے ساتھ وہ سخت رویہ اپنائے جس کا اُسے الزام دیا جاتا ہے؟ یہ وہ بنیادی سوالات ہیں، جن کا جواب طلب کرنا چاہیے۔ لیکن اصل حقیقت تک پہنچنے کی کدو کاوش سیکولر حضرات کا مقصد اور مدعا ہی نہیں۔ ان کا تو ایک ہدف ہے، اور وہ یہ کہ اس طریقہ واردات سے مطلوبہ نتیجہ کیسے حاصل کیا جائے۔ سچ اگر قتل ہوتا ہے تو ان کی بلا سے۔ ڈاکٹر محمد اقبال (م ۱۹۳۸ء) اپنی ایک عظیم نظم میں ان یک چشم متفرین کو ''کور ذوقاں'' کا نام دیتے ہیں کہ انہیں اورنگ زیب کے کمالات نظر نہ آئے اور اُنھوں نے قصے کہانیاں گھڑ لیں:

کور ذوقاں داستاں ہا ساختند　　　وسعتِ ادراک او نشناختند[۲]

اورنگ زیب پر یہ الزام کہ اُس نے اپنے باپ کو قید و بند میں ڈالا، جزوی صداقت کا حامل مقدمہ ہے۔ واقعات کے اعتبار سے یہ سب کچھ اب تاریخ میں مدفن ہے۔ اس پر اس طرح کا تبصرہ کہ یہ واقعات ہوئے ہی نہیں، ایک بے سُود کوشش ہوگی۔ ایسی بات کہنا علمی لحاظ سے نادرست اور غیر منصفانہ سمجھا جائے گا۔

طریقِ تحقیق و تجزیہ کا سوال

کسی بھی تاریخی حقیقت کو جاننے کے لیے پانچ ذرائع اہم ہوتے ہیں:

- تاریخ کے سٹیج پر نمودار ہونے والے اہم کرداروں کی خود نوشت۔

- اُن کے ذاتی روزنامچے اور خطوط۔
- اُس شخص کا کردار جو موضوعِ بحث ہے۔
- ماضی کے معاصر وقائع، خصوصاً اُن حضرات کی تحریریں، جنہوں نے خود اُس زمانے کے حالات کو دیکھا۔
- اور آخر میں وہ مرتب کردہ تاریخ، جو غیر جانبدار مؤرخین نے معروضی انداز میں ضبطِ تحریر کی ہو۔

ان ذرائع میں بھی مسئلہ ہوسکتا ہے۔ یہ کس حد تک قابلِ قبول ہوسکتے ہیں؟ اس بات کا انحصار کئی عوامل پر ہے، مثلاً کسی شخصیت کا خاکہ جو ایک مؤرخ تیار کرتا ہے، حالات اور کرداروں کے ضمن میں کتنا معروضی اور منصفانہ تھا؟ اُس کی قوتِ محرکہ پر کن عوامل کا اثر تھا؟ کیا اس کی پُشت پر کوئی حسد و بغض، نظریاتی، نسلی یا مذہبی تعصب تو موجود نہ تھا؟ اور کیا وہ اتنا عادل اور دیانت دار تھا کہ صحیح شہادت پیش کرسکے؟ کیا اُس میں مناسب اہلیت موجود تھی کہ وہ اپنے تنقیدی مغالطّوں کے جالے صاف کرکے غلط کو سچ سے چھانٹ سکتا تھا؟

ظاہر ہے اس معیار پر چند لوگ ہی اُتر پائیں گے۔ اِس نقطہ نظر سے تاریخ نویسی ایک مشکل فن ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حضرات جو تاریخی مواد کے اس انبار سے اپنے لئے نتائج اخذ کرتے ہیں، اُن میں بھی کم و پیش وہی خوبیاں اور خصوصیات موجود ہونی چاہئیں جو خود تاریخ نویسی کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ تشریحی وضاحت کی اہلیت جسے فرانسیسی فلاسفر میشیل فوکو (Michel Foucault) ماہرِ آثارِ قدیمہ کا نام دیتا ہے، بے حد اہم معاون ہے، ورنہ نتائج بدنما برآمد ہوسکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ انہیں ایسے پروپیگنڈے کا نام دیا جائے گا، جو ایک مخصوص سیاسی ایجنڈا کو آگے بڑھانے کے لئے درکار ہوتا ہے۔

اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تشریحی وضاحت میں ''معنی اور تفہیم کے اُفق'' کا تصور ''لازماً'' شامل ہوتا ہے۔ یہاں مقصود یہ غرض ہوتی ہے کہ بہ ظاہر متناقض اُمور اور اطلاعات میں مشترکات معلوم کی جائیں، تاکہ فہم وادراک کا اُفق اُبھر کر سامنے آئے۔ جس سے واقعات نکھر جائیں اور اُن میں باہم ربط اور توازن کی منطق دکھائی دینے لگے۔ آثار قدیمہ کا علم اپنے اُسلوب تحقیق میں اُس کشادہ مدار کو واضح کرتا ہے، جس میں کوئی بیانیہ نمو پاتا ہے۔ بقول میشیل فوکو: ''ایک وقت تھا کہ علم آثار قدیمہ ایک شعبہ کے طور پر گونگی یادگاروں سے متعلق علم تھا۔ '' وہ یادگاریں جن کا کوئی پسِ منظر نہ ہو'' اور اُس کی خواہش تھی کہ اُسے تاریخ کا مقام ملے۔ اسے معنویت اس وقت ملی، جب اُس نے ایک تاریخی بیانیہ کا رُوپ دھارا: اُس کے بالمقابل ہمارے زمانے میں تاریخ نے کوشش کی کہ اُسے علم آثار قدیمہ کا سا مقام مل جائے، تاکہ وہ تاریخی یادگار کے اندر موجود اس کی نوعیت اور ساخت کو بیان کر سکے۔'' [۳]

مزید برآں اگر ایک تاریخی شخصیت کی چھان پھٹک کرنی ہے اور اس کے ظاہر و باطن کو پوری طرح کھنگالنا ہے تو پھر اُس کی کُلّی شخصیت کا جائزہ لازمی ہوگا۔ جو دراصل مظہر ہے اس کے تاریخی، اقتصادی اور سیاسی ماحول اور اُن سماجی طور طریقوں کا کہ جن میں وہ پلا بڑھا تھا۔ پھر یہ کہ اس کی مادری زبان کیا تھی اور اس نے کون سے علوم پڑھے اور یہ علوم کن سماجی رویّوں کا اظہار کر رہے تھے؟ فوکو ہی کے اندازِ بیان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں ''یادگار کی فطری اور تخلیقی تشریح'' کو معلوم کرنا ہے۔

ماخذوں کا مسئلہ: عیسائی سیاح اور اُن کے تعصبات

اورنگ زیب کے متعلق ان تصورات کا زیادہ بڑا حصہ فرانسیسی سیاح اور معالج فراسوا برنیئے

(Francois Bernier ۱۶۸۸_۱۶۲۵) جیسے لوگوں کی عطا ہے، جو اسلام سے اپنے بغض و عداوت اور عیسائیت کی طرف داری کرتے ہوئے اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی ذرا سی بھی کوشش نہیں کرتے۔ یہ یک چشمی رویہ ہر چیز کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے، سوائے اس کے جو ان کے خیال میں عیسائیت کے لیے مفید مطلب ہو۔ مثال کے طور پر برنیئے، بادشاہ نورالدین سلیم جہانگیر، اور داراشکوہ کی بڑی تعریف کرتا ہے، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ دونوں عیسائیت کی طرف مائل تھے۔

برنیئے جو داراشکوہ کا طبیب رہا تھا، اس کی دل کھول کر تعریفیں کرتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو یہ تأثر دیتا ہے کہ دارا کو بس عیسائی ہی سمجھا جائے۔ وہ دارا کے عیسائیت کی طرف جھکاؤ کے سوتے ریورنڈ بُوزی (Reverand Buzee) سے نیازمندانہ تعلقات کا نتیجہ سمجھتا ہے، جس نے اُسے عیسائیت کی تعلیم دی تھی اور بہت سے عیسائی توپچی بھی مہیا کیے تھے، جن سے اس کا توپخانہ تیار ہوا۔ برنیئے (کے سفرناموں کا مدیر) آرچی بالڈ کانسٹیبل (Archibald Constable)، فراسوا کیٹرو (Francis Catrou) کی ''ہندوستان میں مغل خاندان کی تاریخ'' کی سند کے ساتھ، جو ۱۸۲۶ کو لندن سے شائع ہوئی، یہ اضافہ کرتا ہے کہ اگر ریورنڈ ہنری بُوزی کے ''مشوروں پر عمل کیا جاتا تو قطعی ممکن تھا کہ عیسائیت تختِ (دہلی) پر براجمان ہو جاتی۔'' [۴]

اسلام سے عداوت کا اظہار ہو تو برنیئے ساری احتیاط بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلام ایک ''توہم پرستی'' ہے، ایک ''مہلک اور تباہ کن مجموعۂ قوانین'' ہے جو تلوار کے زور پر نافذ ہوا، اور اب بھی اُسی ظالمانہ تشدّد کے بل پر انسانیت پر مسلط ہے۔ اسلام کو ایک ''قابلِ نفرت فریب'' کا نام دیتے ہوئے وہ اسے ایک بے معنی اور فضول ٹوٹکا قرار دیتا ہے۔ [۵]

جہانگیر بھی عیسائیت کے لئے اپنے دکھاووں اور ظاہری بیانات کی وجہ سے برنیئر سے تائیدی سند حاصل کر لیتا ہے۔ برنیئے کہتا ہے کہ بسرِ مرگ پر جہانگیر نے ''ایک عیسائی کی موت مرنے کی تمنا کی تھی ....''[6] آرچی بالڈ کانسٹیبل، کیٹو سے مستعار ایک اور کہانی بھی سنانے کمال درجے کی جلد بازی کا سہارا لے کر کہتا ہے کہ جہانگیر بعض کھانوں پر اسلامی شرعی قدغنوں سے تنگ آ گیا تھا اور اُس نے یہ جاننا چاہا کہ: ''ہر قسم کے کھانے پینے کی بے قید آزادی کس مذہب میں ہے؟'' علماء نے اسے بتایا کہ ایسا صرف عیسائی مذہب میں ممکن ہے۔ اس پر وہ کہنے لگا: ''پھر تو ہم سب کو عیسائی بن جانا چاہیے۔''[7]

برنیئے نے اسلام کو ''فضول ٹوٹکا'' تک کہہ دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ''جعل ساز'' قرار دیا اور یہ کہ ''یہ دین تشدد سے پھیلا''۔[8] اپنی تحریر کے ان دو صفحات بعد ہی وہ پھسل گیا۔ اب وہ مسلمانوں کی تعریف کر رہا تھا کہ بہ نسبت اس بے اعتنائی کے جو عیسائی اپنے گرجوں میں روا رکھتے ہیں۔ انہیں اپنے دین سے گہری عقیدت ہے۔ بہ قول اس کے ''مسلمان مساجد میں عبادت میں مشغول ہوتے ہیں تو نہ سر کو جنبش دیتے ہیں نہ کوئی ہلکا پھلکا لفظ زبان سے نکالتے ہیں'' بلکہ مسلمان ایک گہری اور حیرت انگیز تعظیم و تکریم کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔''[9]

وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل پر مایوسی کا اظہار بھی کرتا ہے کہ ''مسلمانوں کو کبھی عیسائی نہیں بنایا جا سکے گا۔ نہ اُنہیں باور کرایا جا سکتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جھوٹے نبی تھے۔''[10]

برنیئے منطق میں کمزور واقع ہوا ہے، یا ممکن ہے اس باب میں اس کے تعصّبات اس کی اہلیت پر حاوی ہو گئے ہوں کہ وہ واقعات کو منطقی انداز سے پرکھ سکے، ورنہ وہ ایسی تضاد بیانی سے پہلے ضرور غور کرتا کہ جن لوگوں کی گردنیں اسلام کے سامنے زبردستی جھکائی گئی ہوں، کیا اُن کا اپنے

دین اور نبی سے رویّہ ویسا ہی ہونا چاہیے، جیسے برنیئے بیان کررہا ہے؟ یہ رویہ تو اُن ہی لوگوں کا ہوسکتا ہے جنہیں اپنے عقیدے سے پیار ہواور جو سمجھتے ہوں کہ اسلام ہی صداقت کُلّی ہے۔

مسلمانوں سے اس کا یہی تعصب ہے جو اُسے اورنگ زیب سے متنفر کرتا ہے۔ جب اورنگ زیب نے دکن کی گورنری لینے سے انکار کیا اور اپنے لئے عبادت اور استغراق کی زندگی کو ترجیح دی تو برنیئے کو یہ سب کچھ ایک مذاق آلودہ فریب لگا ''ایسی پرہیزگاری کا ڈھونگ جو اصلاً اس کے دل میں تھی ہی نہیں ...'' وہ اورنگ زیب کی ساری زندگی کو ''سازش اور اختراع کا مستقل سلسلہ'' قرار دیتا ہے۔ [۱۱]

اورنگ زیب کے کردار کی کیفیت اگر یہی تھی تو پھر منطقی طور پر بہت سے لوگوں کو اس کے غیر حقیقی اور ظاہری تقویٰ، نفاق اور مذبذب شخصیت کا پتہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن لگتا ہے اورنگ زیب کی مبینہ چالاکی اور فریب دہی اتنے دبیز پردوں میں چھپی ہوئی تھی کہ سوائے داراشکوہ کے اسے کوئی نہیں جانتا تھا، جو اُسے استہزائی انداز میں ''وہ نمازی'' کہتا ہے۔ یا پھر برنیئے کے مطابق داراشکوہ اسے ''کٹ مُلّا، ہٹ دھرم جو ہر وقت نماز اور اذکار میں مشغول رہنے والا'' [۱۲] کہہ کر مذاق اڑاتا تھا۔ گویا کہ دوسرا کوئی بھی فرد اصل عالمگیر کو نہ جان سکا اور شاہجہانی دربار میں اسے احترام اور استحسان کی نظروں سے ہی دیکھا جاتا رہا۔ ایسی سخن سازی کے سبب برنیئے نہ تو مسلمانوں کے لئے قابل اعتماد مؤرخ ہے اور نہ اورنگ زیب کی ذات اور عہد کے تجزیے کے لیے کوئی سنجیدہ حوالہ۔ دارا نے اس کی ساری توجہ اپنی طرف کھینچ رکھی ہے۔

اس مقصد کے لئے اطالوی سیاح نکولاؤ منہوچی (Niccolao Manucci ۱۶۳۹-۱۷۱۷) یا ژان تیورنیا (Jean Baptiste Tavernier ۱۶۰۵-۱۶۸۹) بھی لائقِ اعتبار نہیں ہیں، کیونکہ انہوں نے بھی مخصوص نقطۂ نظر کے تحت دارا ہی پر نظریں جمارکھی تھیں۔ جو اُنہیں اپنے

خوابوں کا شہزادہ نظر آتا تھا، جو مسلم ہندستان کے تخت پر عیسائیت کو بٹھائے گا۔ مگر اورنگ زیب کی کامیابی نے ان کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا اور یُوں وہ اس کے جانی دشمن بن گئے۔ اس لئے انہوں نے دیانت کا دامن چھوڑ کر پوری ڈھٹائی کے ساتھ اورنگ زیب کی زندگی سے منسوب واقعات میں اپنے خیالات واحساسات کی رنگ آمیزی شروع کردی۔

مثال کے طور پر برنیئے کو اورنگ زیب کا تقویٰ ایک ظاہرداری اور بہروپ لگا جس کو ''اس نے باطن میں کبھی محسوس نہیں کیا''[۱۳]، اس اندازِ فکر کو اورنگ زیب کے کردار کا موضوعی مطالعہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ برنیئے نے لفظ ''felt'' استعمال کیا جو قیاسی اور ثبوت طلب ہے، کیونکہ اس کا تعلق انسان کی سوچ اور ارادے کے مخفی گوشے سے ہے، جس کا باہر سے نہ مشاہدہ ہوسکتا ہے نہ تصدیق۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ بات جس کا تعلق اورنگ زیب سے بنتا ہے، پہلے ان مغربی قلم کاروں کے ذہن سے کشید ہو کر آتی ہے، جہاں اسے گھما پھرا کر مخصوص معنی پہنائے جاتے ہیں، تاکہ وہ ایک چالاک منصوبہ ساز نظر آئے، جو شارک مچھلی کی طرح اپنے شکار کا بے رحمی سے پیچھا کرتا ہے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ برنیئے میں ایسی کوئی پراسرار اہلیت موجود تھی کہ وہ اورنگ زیب کے ذہن میں جھانک لیتا تھا، تب بھی اس کے مشاہدات کا اُن حقائق سے کوئی تال میل نہیں بنتا، جو ہمیں اورنگ زیب کے مکتوبات میں نظر آتے ہیں، اور جنہیں سیّاح موصوف اپنے مقصد کے لیے منتخب طور پر استعمال کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کی تاریخ نویسی ذاتی تعصب کے اظہار میں بدل جاتی ہے۔

اورنگ زیب پر سنگ باری کرنے والے اسی برنیئے نے شاہ جہاں کے اپنی بیٹی شہزادی جہاں آراء (۱۶۸۱-۱۶۱۴) کے تعلق کو جس قبیح انداز میں بیان کیا، وہ بھی عفونت زدگی اور تہمت بازی کا گھناؤنا نمونہ ہے، جس سے قاری کے جذبات واحساسات بری طرح مجروح ہوتے ہیں۔ ایک

سیاح جس نے مؤرخ کا رُوپ دھارا ہوا تھا، اس حد تک چلا گیا کہ باپ بیٹی کے معصومانہ رشتے کو جنسی تعلق کا نام دے بیٹھا۔ واقعی ایسا معاملہ کسی یورپی حاشیہ خیال میں آسکتا ہے (اولٰی لکَ فاَولٰی ۔ثُمّ اَولٰی لکَ فاَولٰی) جسے ہر قرب و تعلق میں جنس ہی نظر آتی ہے۔ خواہ یہ تعلق اتنا پاک، محترم اور مقدس ہو کہ ایک بیٹی اپنے بیمار باپ کی تیمارداری کر رہی ہو۔ برنیئے کا بیان ایک اخلاق باختہ اور ماؤف ذہن ہی کی پیداوار ہو سکتا ہے۔ کہتا ہے: ''یہ افواہ مشہور ہے کہ اس کا اپنی بیٹی سے تعلق اس حد کو جا پہنچا جو ناقابلِ یقین ہے، جس کے لیے جواز اُسے مولویوں کے فتوے سے ملا۔ جنھوں نے اسے بتایا: بادشاہ کو اس درخت کا پھل کھانے سے روکنا ظلم ہوگا، جسے اس نے خود بویا۔'' [14] یہاں جھوٹ افسانہ طرازی اور سکینڈل بازی نے تاریخ نویسی کے بلند و بالا دعوے کو رُسوا کر ڈالا ہے۔ پہلے تو باپ بیٹی کا رشتہ زناکاری میں بدل دیا گیا، پھر مبینہ طور پر باپ معاملہ کو خود طشت از بام کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اس زناکاری کو مذہبی سند دینے کے لئے مولویوں کی مدد حاصل کی جاتی ہے۔ برنیئے نے اس افسانہ طرازی میں حد درجہ غیر ذمہ داری اور لچر پن کو عروج پر پہنچاتے ہوئے سوقیانہ زبان استعمال کی ہے۔

جنسی بدکاری کے تعلقات کہیں بھی ہوں یہ بنیادی انسانی اخلاقی رویّوں کی پامالی ہے، جو لوگوں کو باہمی اعتماد، ذمہ داری اور احترام کے رشتوں میں باندھے رکھتے ہیں۔ انھی اخلاقی رویوں سے ماں، بیٹا، باپ، بیٹی، بھائی، بہن اور ایسے ہی دوسرے خوبصورت رشتے جنم لیتے ہیں۔ قریبی رشتے میں جنسی بے راہ روی تو ہر وہ چیز تباہ و برباد کر دیتی ہے جو سماجی زندگی کی جان ہے۔ اس کا پہلا شکار خاندانی نظام اور اس کا تقدس ہوتا ہے، وہ خاندان جس سے زندگی کو معنی ملتے ہیں اور جو انسان کی شخصی نشوونما کا لازمہ ہے۔ لیکن برنیئے کا بیان کردہ شاہ جہان ایک حد درجہ بیہودہ اور خوفناک نفسیات کا مالک انسان نظر آتا ہے، جو بیٹی سے اپنے جنسی تعلق کو کھلے

عام نہ صرف بیان کرتا بلکہ شریعت سے اس کے لیے مدد چاہتا ہے، معلوم نہیں کون علماء اسے یہ رعایت دے دیتے ہیں کہ ''جو پودا اس نے خود لگایا، اُس کا پھل وہ چُن لے۔''

یہاں ایک لمحے کے لیے رک کر ہم اس بیان کا جائزہ لیتے ہیں۔ برنیئے اپنی لچر بیانی میں یہ بات بھول جاتا ہے کہ جو ظاہر ہو اور جس کے متعلق ملاؤں کا فتویٰ موجود ہو، اسے ''افواہ'' نہیں کہا جا سکتا، وہ امر واقعی ہوتا ہے۔ بات اگر منطق کی ہو اور استدلال پر مبنی واقعات و حالات ہوں تو برنیئے یہاں پر اپنے قاری کو بالکل مایوس کر دیتا ہے۔ برنیئے کے مدیر کانسٹیبل نے فراسوا کیٹو جو حاشیہ اپنے بیان میں ضمناً جوڑا ہے، وہ اس سارے قصے کو لغو بتا کر رد کر دیتا ہے کہ ''بدنیت اور کینہ ور درباریوں کے علاوہ کہیں اور اس افسانہ طرازی کا شائبہ تک نہیں ملا۔'' [۱۵]

برنیئے چونکہ اسلام کے خلاف اپنے بُغض و عداوت سے جان چھڑا نہیں پاتا، اس لئے وہ امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (۱۵۶۴-۱۶۲۴) کی اسلامی تحریکِ احیاء اور اس سے مثبت اثر لینے والے افراد کا تذکرہ نہیں کرتا اور انہی متاثرین میں سے ایک خود شاہ جہاں بھی تھا۔ اورنگ زیب کے مکتوبات میں شاہ جہاں کے اعلیٰ اخلاقی مرتبے اور اسلامی تعلیمات کے لئے اس کے دلی احترام کا بیان موجود ہے۔ بے چاری جہاں آراء، جسے برنیئے اپنے غیر ذمہ دار قلم کاری سے ذبح کر کے رکھ دیتا ہے، وفورِ جذبات سے اپنے باپ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ دین کے لئے احترام کے جذبات رکھتا تھا اور اخلاقی طور پر بلند شخصیت تھی:

> ''از اوّل تا ایں دَم، اُس نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات پر کتاب و سنّتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق عمل کیا۔'' [۱۶]

یہ اندرونی شہادت زیادہ وزنی اور قابلِ قبول ہے، کیونکہ یہ کسی اور نے نہیں بلکہ اس کی بیٹی نے

دی، جس سے شاہ جہاں طرف منسوب بھی غلط باتوں کی تردید ہو جاتی ہے۔ اسلام کے لیے شاہ جہاں کی خدمات بڑی واضح ہیں، جبکہ اکبر اور جہانگیر کی پالیسیوں سے بہت کچھ نقصان ہو چکا تھا۔ جہاں تک اس کا اپنی اولاد سے تعلقات کا معاملہ ہے، یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ دارا شکوہ اور جہاں آراء کے ساتھ شاہ جہاں کو بہت پیار تھا اور انہیں اپنی بھرپور توجہ سے نوازتا رہا۔

تیورنیا (Tavernier) کا معاملہ یہ ہے کہ اورنگ زیب اور شاہ جہاں تعلقات کے بیان میں اس نے بدترین تعصب کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسے یہ بات ''عجیب'' لگتی ہے کہ اورنگ زیب نے باپ کے اخراجات پر قدغن لگائی اور خزانہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔[۱۷] حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اورنگ زیب کو ختم کرنے کے لئے دارا کی کوششوں کو مالی معاونت شاہ جہاں ہی فراہم کر رہا تھا۔ تیورنیئر کو یہ بات جاننا چاہیے تھی کہ دارا شکوہ کو ملنے والی رقوم کا سلسلہ نہ روکا جاتا تو ملک میں افراتفری، انتشار اور ہنگامہ جاری رہتا۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ تیورنیا کے سوانح نگار پروفیسر چارلس جورٹ (Charles Joret) اس کی تحریروں کو اپنی تحقیق مطبوعہ ۱۸۸۶ء (پیرس) میں چربہ سازی کا نام دیتا ہے اور واضح طور پر کہتا ہے کہ وہ اپنا تاریخی مواد برنیئر ہی سے مستعار لیتا ہے۔[۱۸] جب کہ ایچ۔اے روز اس کے استنادی دعووں پر یہ سوال اٹھاتا ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے کہ جس کے بارے میں یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان واقعات کا چشم دید گواہ نہ تھا، ''جب کہ اس نے دعوے یہی کیے ہیں کہ اس نے وہ واقعات خود دیکھے ہیں۔''[۱۹] روز (Rose) یہ بھی بتاتا ہے کہ: ''بیجاپور کے متعلق اس کے بیان نے ایک مضبوط شبہے کو کھڑا کر دیا ہے، کیونکہ وہ تو کبھی اس شہر میں گیا ہی نہیں تھا''۔[۲۰] لغت اور زبان پر اس کا عبور بھی بے حد کمزور تھا: ''جستہ جستہ دو ایک الفاظ'' کی حد تک۔[۲۱]

تاریخی پس منظر کا جائزہ

سچائی تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم تینوں کرداروں - شاہ جہاں، داراشکوہ اور اورنگ زیب - کا جائزہ لیتے ہوئے آٹھ پہلوؤں کو پیش نظر رکھیں، تاکہ ہر ایک کے طرزِ عمل کو اچھی طرح سمجھا جاسکے:

اوّل، کیا مغلیہ دور میں ولی عہدی کی کوئی باقاعدہ پالیسی موجود تھی؟

دوم، اپنے بڑے بیٹے داراشکوہ کے ساتھ شاہ جہاں کا طرزِ عمل کیسا تھا؟

سوم، شاہ جہاں کا اپنے تیسرے بیٹے اورنگ زیب سے رویہ کیسا تھا؟

چہارم، داراشکوہ کا اپنے چھوٹے بھائیوں سے سلوک کیسا تھا؟

پنجم، اس وقت کا عمومی سیاسی وسماجی ماحول کیسا تھا؟

ششم، کیا کوئی دھڑے بندی موجود تھی۔ جو مخالف مذہبی کیمپوں میں مجتمع ہوگئی ہو؟

ہفتم، کیا ایسے دونوں کیمپ خاموش بیٹھے تھے یا آپس میں دست وگریباں تھے؟

ہشتم، شاہجہانی دربار کے اکابرین، اہل الرائے، علمائے کرام اور عام لوگ اس سارے معاملے کو کیسے دیکھ رہے تھے؟

یہ سارے پہلو جواب طلب ہیں، کیونکہ ان کے بغیر تاریخ کے اس اہم دور اور اُس میں ملوث ان باپ بیٹوں کا کردار دُھندسے باہر نہیں نکلے گا۔ شاہ جہاں ہو یا کوئی دوسرا مغل حکمران، ولی عہدی کے ضمن میں ان کے ہاں کوئی باقاعدہ پالیسی نہیں تھی۔ اسی طرح یہ روایت بھی موجود نہیں تھی کہ باپ کی گدی پر لازماً بڑا بیٹا ہی براجمان ہوگا۔ بلکہ تخت وتاج اُسے ہی ملتا تھا، جو کشمکش میں سب سے سخت جان اُبھرے۔

شاہ جہاں بالکل اچانک بیمار پڑا۔ ہوسکتا ہے اُسے پہلے سے کچھ بیماری لاحق ہو، لیکن جب زوال کا وقت آیا تو سب کچھ اچانک ہوا اور وہ حکمرانی کی باگ تھامے رکھنے کے قابل نہ رہا۔ اپنی بیماری سے برسوں پہلے اپنی اولاد کی حکمرانی کی صلاحیتوں پر ایک درباری سے بات کرتے ہوئے اس نے داراشکوہ پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا، جبکہ اورنگ زیب کے متعلق اُس نے مثبت رائے دی۔ بیشک اس کا دل دارا کے ساتھ تھا، اور عقل کا فیصلہ اورنگ زیب کے حق میں تھا۔ لیکن بالآخر دلی جذبات نے عقل وخرد کو چت کر دیا۔

کوئی چاہے تو دارا کے لئے شاہ جہاں کی محبت کا معقول جواز پیش کر سکتا ہے۔ یہ ممکن بھی ہے کہ چونکہ دونوں ہمیشہ یکجا رہے، اس لئے اس پدری شفقت میں اضافہ ہوتا گیا۔ بیشتر وقت شاہ جہاں نے دارا کو دربار سے قریب رکھا، جبکہ اس نے دوسرے بیٹوں کو صوبوں کی گورنری اور انتظامی اُمور میں مشغول رکھا۔ باپ بیٹے کے قرب وتعلق کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ داراشکوہ ذاتی طور پر ایک پُرکشش انسان تھا اس کا رکھ رکھاؤ، علم وادب سے اس کا لگاؤ، اس کی دلچسپ صوفیانہ حکایت گوئی جو اس میں صوفیاء اور ہندو جوگیوں کی صحبت سے پیدا ہوئی تھی۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ دارا اپنے باقی بھائیوں سے زیادہ وجیہہ، خوبصورت اور خوش اطوار تھا۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ، لیکن وہ اُمورِ سلطنت کے لئے نہیں بنا تھا۔ ذہنی صلاحیتیں ہوں یا جسمانی خوبیاں، اس کا اورنگ زیب سے کوئی تقابل نہ تھا۔ زندگی کے متعلق اس کے رویے میں بھی خرابی تھی۔ وہ آزاد خیال بھی تھا اور مذہبی معاملات میں، عقائد میں تطبیق دینے والا صلح کل، یعنی اکبری پالیسی کا پیروکار بھی تھا۔ اسے ہندو دانشوروں اور مذہبی پنڈتوں نے گھیرا ہوا تھا۔ ایک ایسے مسلم معاشرے میں جو ہندوانڈیا میں اپنی شناخت اور بقا کے حوالے سے روز افزوں پریشانی کا شکار تھا، وہ قابل قبول کردار نہ تھا۔ ان احساسات کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تجدیدی تحریک مزید تیز تر کر رہی

تھی۔ مسلمان عوام سمجھ رہے تھے کہ اگر دارا اقتدار میں آیا تو یہ ان کی بربادی کا پیغام ہوگا۔

سب سے بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے داراشکوہ کے ذہن میں بچپن ہی سے یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ مستقبل کا حکمران ہے۔ پیار، محبت اور نیازمندی کا جو پُر سرور ہالہ اس کے گرد موجود رہا، اس میں اس کی اُٹھان ایک انا پرست، خوشامد پسند اور بڑبولے انسان کے طور پر ہوئی۔ ماحول کی ساری آسانی اور سازگاری کے باوجود وہ خوداعتمادی سے عاری اور داخلی سطح پر ایک مضطرب و مذبذب انسان تھا۔ یہ چیزیں اس کے احوال و آثار سے بآسانی دیکھی جاسکتی ہیں۔ حسد اور خوف کے جذبات اس کے دماغ میں جنم لیتے اور ظاہری زندگی میں اُبھرتے رہے۔ وہ یہ حقیقت نہ سمجھ سکا کہ اصل مسئلہ خارج میں نہیں بلکہ خود اس کے اندر اُس کی ذات میں پیوست ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی اورنگ زیب کی شکل میں وہ اپنی شکست دیکھ رہا تھا۔ اورنگ زیب کی فوجی فتوحات، انتظامی کامرانیاں اور اس کے مقابلے میں اپنی ڈھل مِل کیفیت اور سرکاری اُمور میں بُری کارکردگی کے زیر اثر وہ اعصابی تناؤ کا شکار ہوتا چلا گیا۔ اس کی اس ذہنی حالت کا اظہار اُن سازشوں سے ہورہا تھا جو وہ بھائی کے خلاف کر رہا تھا۔

اپنے آپ کو غیر محفوظ جان کر اُسے اسی راستے میں عافیت دکھائی دی کہ باپ کی محبت، قوت اور وسائل کے ساتھ مضبوطی سے جُڑا رہے، اور اسے دوسرے بیٹوں سے بدظن کر کے دور رکھے۔ اس مقصد کے لیے اورنگ زیب کی بھیانک تصویر کشی ضروری تھی۔ اس کے بارے میں یہ تاثر گھڑا گیا کہ وہ آگے بڑھنے کے مرض کا شکار تھا اور یہی عزائم اُسے مجبور کر رہے تھے کہ بغاوت کی آبیاری کرے، اور جسے اپنے ماں باپ کی کوئی فکر نہیں۔[۲۱] ان باتوں نے شاہجہاں کو اورنگ زیب کی طرف سے مستقلاً تشویش میں مبتلا کر دیا۔

شیخ احمد سرہندیؒ کی احیائی تحریک نے سترہویں صدی عیسوی کے ماحول میں بڑی ہلچل پیدا کردی تھی۔ جب اورنگ زیب اور اس کے بھائی نوجوانی کی سرحد میں داخل ہوئے تو یہ تحریک پورے زوروں پر افقی اور عمودی ہر دو سطح پر آگے بڑھ رہی تھی۔ اس تحریک سے پہلے شاہجہاں روشناس ہوا اور پھر خود اورنگ زیب متاثر ہوا۔ عوام الناس تو پہلے ہی اس کے زوردار بہاؤ کے ساتھ تھے۔

اس کے برعکس مذہب اور ثقافتوں کے حوالے سے داراشکوہ کا طرزِ عمل ہندو اشرافیہ اور انتظامی اہلکاروں کے لیے جذباتی اپیل رکھتا تھا۔ وہ دارا کی شکل میں اکبر بادشاہ کا دوسرا جنم دیکھ رہے تھے کہ جس کی تخت نشینی سے بالآخر اسلام مقامی اثر پذیر ثقافت میں اپنا وجود کھو بیٹھے گا۔ اسی لیے انہوں نے اپنا سب کچھ دارا پر لگا دیا تھا۔

چنانچہ ہم اس صورتِ حال میں جو کچھ دیکھ رہے ہیں، وہ مسخ شدہ نفسیات، طاقت کے کھیل، اندھی محبت اور ایک ابلتا ہوا تہذیبی آمیزہ ہے۔ جب پس منظر میں یہی تصویر دکھائی دیتی ہے تو مذکورہ شخصیات، اورنگ زیب اور دوسرے لوگوں کے عزائم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔۔

سب سے پہلے ہم برنیئے کے اس الزام کو لیتے ہیں: ''کہ جب اورنگ زیب نے اوائل میں دکن کی گورنری چھوڑنے کی آرزو کی تو اس کے پیچھے اخلاص نہیں تھا'' بلکہ یہ باپ اور بھائیوں کو اقتدار اور حکمرانی کے منظر سے ہٹا کر سلطنت ہتھیانے کی تدبیر تھی۔ وہ اُس کی شخصیت کو محض دجل وفریب سمجھتا ہے اور اُس کی مذہبیت کو دکھاوا قرار دیتا ہے، سر دست ہم ان الزامات کو جوں کا توں قبول کرتے ہوئے شواہد ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ معاملہ تحقیق کا بہت اہم سوال لیے ہوئے ہے۔ کیونکہ اگر اورنگ زیب کوئی مکار بہروپیا تھا، تب برنیئے کے الزامات

واقعی سچ ثابت ہوں گے۔لیکن اس کے برعکس اگر وہ ایک مخلص اور راست باز انسان تھا اور اس کے قول وفعل میں تضاد نہیں تھا تو اس کے خلاف سارے الزامات پادر ہوا ہوں گے۔

اورنگ زیب کے مکتوبات کے مطابق اس نے دو بار گورنری سے دست برداری کی پیش کش کی، لیکن باپ کی ناراضی دیکھ کر فیصلہ واپس لے لیا۔اس کا پہلا استعفا اس وقت سامنے آتا ہے جب اسے دکن کا گورنر نامزد کیا جاتا ہے۔دس برس بعد وہ پھر اُس موقع پر یہ پیش کش دہراتا ہے، جب اس کی بہن شہزادی جہاں آراء اپنی سالگرہ پر آگ میں جھلس جاتی ہے۔اورنگ زیب اُسے دیکھنے آتا ہے۔شاید بہن کی حالت دیکھ کر وہ اتنا دل گرفتہ ہوتا ہے کہ وہ شاہی لذائذ واقتدار پر لات مار کر تنہائی اور خلوت گزینی کی زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔[۲۲]

اس کے ایک مکتوب میں دست برداری کی وجہ درج ہے۔اپنی بہن کو لکھے گئے خط میں وہ اُن ناانصافیوں کا تذکرہ کرتا ہے جو اس کے ساتھ کی گئیں۔اگرچہ وہ کسی کا نام نہیں لیتا، لیکن واضح طور پر اس کا اشارہ باپ اور بڑے بھائی داراشکوہ کی طرف ہے۔زیادہ دُکھ اُسے داراشکوہ کے ہتک آمیز رویے سے تھا، جس نے شاہجہاں کو آمادہ کر کے، شورش زدہ دکن کے گورنر کی حیثیت سے اس کے انتظامی فنڈ کاٹ دیے اور ایک ایسے وقت اس کی زیر کمان فوج میں کمی کرادی، جبکہ وہ مملکت کے دشمنوں سے برسرِ پیکار تھا۔اس تجربے نے اسے داخلی سطح پر توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ زندگی میں پہلی بار وہ دنیا کا حقیقی چہرہ دیکھ رہا تھا: بدشکل، مکروہ اور ظالم دنیا، جس میں قابلیت اور عبقریت، اخلاق اور مملکت کے لئے خدمات کی کوئی قدر و قیمت اور وقعت نہ تھی۔وہ لکھتا ہے:

اس فانی دنیا اور اس کے فوائد ومنافع کے لیے جان لڑانا بے سود ہے۔وہ بے توقیری کی اس زندگی سے چھٹکارا چاہتا ہے جو دوسروں نے اس پر تھوپ دی تھی، تاکہ دوسروں کو سکون میسر

آجائے کہ اچھا ہوا اقتدار کی راہداریوں سے ایک ممکنہ چیلنج تو رخصت ہوا۔[۲۳]

ان خطوط سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اورنگ زیب کو اقتدار کی کوئی شدید خواہش تھی، بلکہ وہ تو سب کچھ دوسروں کے لئے چھوڑ کر گوشہ نشین ہونا چاہتا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہی اورنگ زیب جوان لوگوں کی نظر میں ایک ہٹ دھرم شخص تھا، جس نے ان کے بقول چالاکی سے زہد و تقویٰ کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا، وہ تخت نشینی کے بعد ۴۳ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیتا ہے۔[۲۴] اس کا ہم عصر شاعر ضمیران مبارک لمحات کو اپنے ایک قطعہ میں جاوداں کر دیتا ہے۔

توحامیِ شرع وشارع حامیِ تو
توحافظِ قرآں و خدا حافظِ تو
تودین وشریعت کا حامی ومددگار ہے
اور شارع تیرا حامی اور ناصر ہے، تو حافظِ قرآن ہے اور
خدا تیرا حافظ ہے۔

اُس کا ۴۳ سال کی عمر میں قرآن پاک کو حفظ کرنا خصوصاً اہم بات ہے۔ کیونکہ چھوٹی عمر کے برعکس اتنی بڑی عمر میں حفظِ قرآن بہت مشکل کام ہے۔ بچے تو والدین کے دباؤ اور استاد کی سختی کے تحت ایسا کرتے ہیں، لیکن بڑی عمر کا انسان آزاد مرضی سے حفظ کی مشقت اسی وقت اُٹھائے گا جب دینی جذبہ اسے ایسا کرنے پر اُبھارے گا۔

کافی شہادت موجود ہے کہ اورنگ زیب باجماعت نماز کا پابند تھا اور بڑے شوق سے روزے رکھتا تھا۔ غریب کی مدد کا معاملہ ہوتا تو اس کے ہاتھ بڑے فراخ تھے۔ تاج پوشی کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ عام آدمی کو متاثر کرنے والے اسّی (۸۰) ٹیکس ختم کر دیے۔ ''مآثر عالمگیری''

میں ہے کہ حالتِ جنگ میں بھی وہ خشوع کے ساتھ نماز ادا کیا کرتا تھا۔ بلخ کی مہم کے دوران دشمن کے دستوں نے اسے گھیر لیا تھا لیکن (نماز کے وقت) وہ گھوڑے سے اترا اور امامت شروع کر دی۔ امیر بلخ عبدالعزیز خان یہ منظر دیکھ کر اتنا سخت متاثر ہوا کہ اُس نے لڑائی سے یہ کہہ کر ہاتھ کھینچ لیا کہ: ''ایسے شخص سے لڑنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔''[۲۵]

اورنگ زیب عالمگیر کا رویہ اپنے ذاتی سٹاف، امرائے دربار اور عام لوگوں کے ساتھ یکساں لحاظ، مروت اور مساوات کا تھا۔ باپ نے جب نصیحت کی کہ ''سب کو ایک سا نہ سمجھے اور مقام و مرتبے کے لحاظ سے تمیز روا رکھے۔'' تو اُس نے جو جواب دیا وہ اس کے اعلیٰ اخلاق کا مظہر تھا۔ کہتا ہے: ''عزت اور سر بلندی انسانوں سے نہیں ملتی، بلکہ کائنات کے خالق اور مالک اللہ کے حضور سے نصیب ہوتی ہے۔'' اپنے برتاؤ میں وہ اس حدیث نبویؐ کا اتباع کرتا ہے جس کے راوی حضرت انس بن مالکؓ ہیں: مَنْ اَذَلَّ نَفْسَهُ. عَزَّزَهُ الله (جو عاجزی اختیار کرتا ہے، اللہ اُسے عزت سے نوازتا ہے)[۲۶]۔ اورنگ زیب سمجھتا تھا کہ کسی کی عزت نفس کو مجروح کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔

تخت نشینی کے بعد اس نے نفاذِ شریعت کے لئے بنیادی اقدامات کیے۔ اخلاقی ماحول کو گندگیوں سے پاک کیا۔ جید علماء کی مجلس قائم کر کے قوانین کی تدوین کی، جس کے نتیجے میں ''فتاویٰ عالمگیری'' منصۂ شہود پر آ گئی۔ یقیناً اس کے یہ سارے اقدامات مذہبی بہروپ کے زمرے میں قطعاً نہیں آتے۔

اورنگ زیب نے شاہی خانوادے میں آنکھ کھولی۔ وہ شاہ ابن شاہ تھا، جس کے پاس ایک ایسی مملکت کے کُلّی اختیارات اور بے پناہ وسائل تھے، جو اپنے وسیع خزانوں کے لئے مشہور تھی۔ وہ

چاہتا تو ہمارے آج کے ''منتخب'' حکمرانوں کا چال چلن اپنا سکتا تھا کہ نفسانی عیش وعشرت میں لُوٹ لگا تا رہتا۔ لیکن وہ اپنے رب اللہ بزرگ و برتر کی کبریائی و جبروت کے حضور جُھک گیا۔ نرم وگداز بستر سے علیحدہ رہ کر اس کی راتیں تہجد میں گزرتیں۔ زیادہ اہم بات یہ کہ وہ تہذیبوں کے اسبابِ زوال پر بڑی گہری نظر رکھتا تھا۔ وہ اکثر اس فکر اور تشویش میں مبتلا رہا کہ برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ اُسے سامنے تاریک دن نظر آرہے تھے۔ اس کے اجداد اور پیش رووں نے اسلام کی تبلیغ اور استحکام میں برس ہا برس جس تساہل اور لاپروائی سے کام لیا تھا، اس کے اثرات سامنے آرہے تھے۔ وہ اس تباہی و بربادی کا رُخ موڑنا چاہتا تھا۔ اورنگ زیب کی تاریخی یادداشت بہت تیز تھی۔

اورنگ زیب نے ایسے ملک میں آنکھ کھولی جس نے جلال الدین اکبر کی اسلام سے دشمنی بھی دیکھی، جس کی یہ خواہش اور کوشش تھی کہ مسلم سوسائٹی کو دینِ اسلام سے پھیر دے اور اس کے نتیجے میں (ہندوؤں کی خوش دلی اور تعاون کی شکل میں) اپنے لئے سیاسی فوائد سمیٹ لے۔ اورنگ زیب کو اپنے پردادا اکبر، اپنے دادا جہانگیر اور شیخ احمد سرہندی کے باہمی نزاع کا بھی پورا علم تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اکبر نے تو بچوں کے ناموں کے ساتھ ''محمد'' کا لاحقہ لگانے کی بھی ممانعت کردی تھی، اسلامی کیلنڈر منسوخ کردیا تھا اور عربی زبان، قرآن پاک اور شرعی قوانین کی تعلیم پر پابندی عائد کردی تھی۔ اُس سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی کہ اکبر نے مسلمانوں کو نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور حج بیت اللہ تک پر جانے سے روکنے کا حکم دیا، جبکہ شراب نوشی اور سُور کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

بقول یورپی مؤرخ ونسنٹ سمتھ (Vincent A. Smith) جس نے اکبر پر تحقیقی کام کیا

ہے، اسے اکبر مسلمان نہیں نظر آتا تھا۔ برنیئے کا مدیر آرچی بالڈ کانسٹیبل، کارتُو کی سند کے ساتھ کہتا ہے: ارتداد شاہی خاندان میں در آیا تھا۔ شاہ جہاں کی دو بیٹیوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔[۲۸] اس درجہ سنگین صورتِ حال میں مسلمان جانتے تھے کہ وہ عددی اعتبار سے اقلیت ہیں اور بحیثیت مسلم اُمت اُن کا وجود اپنے عقیدے سے مضبوطی سے جڑے رہنے پر منحصر تھا۔ کفر کے اس ماحول میں بقا کے لیے وہ لازمی طور جانتے تھے کہ ان کے تہذیبی رویے ہر طرح کے غیر اسلامی اثرات سے پاک رہنے ضروری ہیں۔

اس پسِ منظر میں اورنگ زیب، داراشکوہ چپقلش محض تختِ دہلی کا جھگڑا نہ تھا۔ یہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین تہذیبوں کا ٹکراؤ کا فطری مظہر تھا جن کی نمائندگی دو مثالی نمونے (عالمگیر اور دارا) کر رہے تھے۔ داراشکوہ سمجھتا تھا کہ اُپنشد (Upanishad) قرآن پاک سے برتر کتاب ہے۔ اس نے ''سیر الاسرار'' کے نام سے خود اس کا فارسی ترجمہ کیا۔ الہ آباد کے شیخ محبّ اللہ کے نام اس کا خط تاریخ نے محفوظ رکھا ہے، جس میں وہ اس حد تک جاتا ہے کہ وہ اپنے ''وجدانی معارف واثرات کو (الہامی) کتب کے مندرجات سے بدرجہا بہتر سمجھتا ہے۔[۲۹]

داراشکوہ کے ایسے خیالات مسلمانوں میں بے چینی اور اشتعال پیدا کر رہے تھے۔ شاہی تخت پر اس کے ممکنہ قبضے کا خیال ہندوؤں کو اس کی طرف کھینچ رہا تھا، کیونکہ دارا کی کامیابی میں انہیں مسلمانوں کے تسلط کے خاتمے کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ مسلمانوں کے لئے ہندوؤں کا داراشکوہ کی نامزدگی پر مجتمع ہونا گزرے ہوئے عہدِ اکبری کی تاریخ دہرائے جانے کے مترادف تھا۔ ایک بار پہلے بھی ہندوؤں نے یہ کوشش کی تھی کہ ایک ہندو رانی کے بطن سے پیدا ہونے والا جہانگیر کا بیٹا خُسرو، اکبر کا جانشین بن جائے۔

۱۶۵۷ عیسوی کی ابتداء یں شاہ جہاں بیمار پڑا تو سلگتے جذبات، جو ابھی تک قابو میں تھے، دو مخالف اور متحارب قوتوں میں ڈھلنے لگے۔ داراشکوہ نے اس میں امکانات کو سب سے پہلے بھانپا اور شاہ جہاں کو اس کے دوسرے بیٹوں سے کاٹ کر جدا کر دیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے دربار کو ایسے امراء سے پاک کرنا شروع کر دیا، جن کے متعلق اندیشے تھے کہ وہ دوسرے شہزادوں خصوصاً اورنگ زیب سے مراسم رکھتے ہیں۔ دربار میں اورنگ زیب کے رابطہ افسر عیسیٰ بیگ کو پہلے حوالۂ زنداں کر دیا گیا، پھر اس کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔ داراشکوہ نے مُراد بخش (م: ۱۶۶۱ء) کے خلاف بھی اقدام کیا اور گجرات میں اس کی جگہ اپنے حامی قاسم خان کو مقرر کر دیا۔ فتنہ انگیزی بڑھانے کے لئے اس نے مُراد کو آمادہ کیا کہ برار میں اورنگ زیب کا علاقہ اپنے قبضے میں لے لے، تاکہ دونوں میں جنگ بھڑک اُٹھے۔ لیکن مُراد کو سازش کی سُن گن مل گئی۔ اس نے سُورت فتح کر کے خود اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

اورنگ زیب اس ساری صورتِ حال کا دکھ اور افسوس کے ساتھ مشاہدہ کر رہا تھا۔ ہر گزرے دن کے ساتھ وہ داراشکوہ کے ہاتھ اپنی گردن پر تنگ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اگر داراشکوہ کی صوفی طبیعت میں کوئی خفیہ پہلو تھا تو وہ جلد ہی ظہور میں آنے والا تھا۔ اس کے ضمن میں تین باتیں بالکل واضح تھیں: وہ اسلام کا مخالف اور آزادرَو تھا اور تخت پر قبضہ کے لئے پوری بے رحمی سے سب کچھ کر گزرنے پر تُلا ہوا تھا، خواہ اس کی جو بھی قیمت اُسے چکانی پڑے۔ اس نے قبیح حربے جاری رکھے۔ وہ شاہ جہاں کے جعلی دستخطوں کے ساتھ شاہی فرامین جاری کرتا، شاہجہاں کے صحت مند ہونے کا تاثر پھیلاتا اور بھائیوں کے خلاف ایک عظیم جنگی مشین کی تیاری اور تقویت میں جتا رہا۔ پہلے قدم کے طور پر اس نے دکن سے مغل افسران کو واپس بلا لیا، جو دراصل اورنگ زیب کا سیاسی حلقۂ اثر تھا۔ پھر اس نے مالوہ کو ضبط کر لیا جو اورنگ زیب کی جاگیر تھی۔ یہ گویا

اورنگ زیب کی پشت میں خنجر گھونپنا تھا، جو اس وقت بیجا پور میں جنگجو ہندو مرہٹوں سے برسرِ پیکار تھا، جو سلطنت دہلی کے دشمن تھے۔ کوئی شک نہیں کہ اورنگ زیب کے لئے بے حد مشکل صورتِ حال پیدا کردی گئی، جو بیجا پور اور گولکنڈہ کو یہ تأثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ مملکت مختلف دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مرکزی اقتصادی امداد اور فوجوں میں کٹوتی نے دکن میں اس کی موجودگی قریب قریب غیر یقینی بنادی تھی۔ بڑا بھائی کُھل کر اس کے خلاف میدان میں آگیا تھا۔ اورنگ زیب کی تحقیر کرنے والے بتائیں کہ ان حالات میں اُسے کیا کرنا چاہیے تھا؟ کیا وہ اپنا آپ ایک منتقم مزاج بھائی کے سامنے ڈال دیتا یا اپنی زندگی بچاتا؟

اس خونیں اور مایوس کن منظر میں شہزادہ شجاع (م: ۱۶۶۰ء) نے بھی اپنی تخت نشینی کا اعلان کردیا۔ بالفاظِ دیگر اورنگ زیب جس نے اپنی شاہی خواہشات کو تھامے رکھا تھا، مگر اس کے سامنے تخت کے تین دعوے دار سامنے آگئے تھے۔ تنِ تنہا اس نے جلد سے جلد شاہ جہاں تک پہنچنا چاہا۔

جنوری ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب برہان پور پہنچا۔ وہیں سے اس نے باپ کو خط لکھ کر اس کی صحت کا پوچھا۔ مہینہ بھر انتظار کے باوجود اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ اُسے اب بھی معلوم نہ تھا کہ آگرہ میں کیا کھچڑی پک رہی تھی۔ ایسے میں اچانک عیسیٰ بیگ، قید خانے سے آزادی ملتے ہی اورنگ زیب کے لشکر گاہ میں وارد ہوا، اور شاہی دربار میں جاری داراشکوہ کی ریشہ دوانیوں کے قصے عالمگیر کے گوش گزار کردیے۔ یوں خبردار ہوکر اورنگ زیب، مُراد سے ملنے دیپال پور چل پڑا۔ وہاں سے دونوں بھائی آگرہ کی طرف روانہ ہوئے تاکہ بیمار باپ کو دیکھ سکیں اور اس سے داراشکوہ کے ضمن میں انصاف کے طلب گار ہوں، جو اُن کے خلاف ''مارو یا مرجاؤ'' کے

منصوبے باندھے بیٹھا تھا۔ جنگی چالوں کا ماہر ہونے کی بناء پر اورنگ زیب ایک ہی حملے میں شہر پر قبضہ کر سکتا تھا، لیکن وہ اب بھی صبر و ضبط سے کام لے رہا تھا۔ اس نے اپنا قاصد راجا جسونت سنگھ کے پاس بھیجا اور اس پر زور دیا کہ وہ بادشاہ تک اورنگ زیب کے جانے کی راہ میں مزاحم نہ ہو، کیونکہ اس کے پیش نظر صرف ملاقات تھی۔ لیکن جسونت سنگھ نے سخت ہتک آمیز انداز میں اُسے راستہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے اورنگ زیب کی شخصیت کا ذرا بھی لحاظ نہ کیا۔ بلکہ مزید یہ بھی کہہ دیا کہ یہی بادشاہ سلامت کی مرضی تھی۔ ۳۰

یہ دیکھ کر کہ جھگڑا بڑھ رہا ہے، دربار کے مسلمان امراء نے بھی دارا شکوہ کو مشورہ دیا کہ اورنگ زیب کو باپ سے ملنے دے۔ لیکن اس وقت تک ہندو حلقہ دارا شکوہ کے گرد مکمل ہو چکا تھا، اور دارا کو اب باپ، بھائیوں کے برعکس وہی اچھے لگ رہے تھے۔ راؤ ستر سال اور رام سنگھ نے رائے دی کہ مقابلہ کیا جائے اور دارا شکوہ فوراً تیار ہو گیا، کیونکہ اُسے اورنگ زیب کے خلاف من کی مراد، اسی میں پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اس طرح ہندو مدد اور تائید سے حوصلہ پا کر اس نے مسلمانوں کے خلاف یہ ذلت آمیز الفاظ کہے: ''بہت جلد میں ان کوتاہ لباسوں کو ستر سنگھ کے ذاتی ملازموں کی طرح بھاگنے پر مجبور کر دوں گا۔'' ۳۱

اُدھر وہی ہوا جو ہونا تھا کہ راجہ جسونت سنگھ، اورنگ زیب کے دستوں سے پہلی جھڑپ ہوتے ہی بھاگ دوڑا۔ اورنگ زیب چاہتا تو اسے روند کر رکھ دیتا، لیکن اس نے خود اُسے فرار ہو جانے دیا۔ شاہ جہاں کے نام اپنے ضمنی مکتوب میں وہ اپنی سوچ کا اظہار یوں کرتا ہے:

> ''اگر میرا آپ سے ملنے کے علاوہ کچھ اور مقصد ہوتا تو میں بڑی آسانی سے جسونت سنگھ اور اس کے لشکریوں کا تعاقب کر کے ان سب کو موت کے

گھاٹ اُتار دیتا۔ خصوصاً جبکہ وہ بے بس اور ذلیل ہو کر شکست کی وادی میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ ... لیکن مقصد تو آپ تک پہنچنے کے لئے راستہ حاصل کرنا تھا۔''[۳۲]

بنگالی نژاد ہندو مؤرخ سر جادوناتھ سرکار (م:۱۹۵۸ء)، جو اپنے تعصّبات پر بمشکل پردہ ڈال پاتا ہے، اورنگ زیب سے دشمنی کے جذبات رکھنے کے باوجود اس کی تائید کرتا ہے:

''اورنگ زیب نے رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تعاقب کی ممانعت کردی، اور کہا کہ: انسانی جانوں کی یہ معافی خالق کے حضور اس کی طرف سے زکواۃ تھی۔ ...''[۳۳]

تاہم جادوناتھ سرکار ڈنک مارے بغیر نہیں رہا: ''لیکن ظاہر ہے اورنگ زیب کے عقیدے کے مطابق خالق صرف مسلمانوں کا خالق ہے۔ شہزادے نے افسروں کو حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان جو میدان میں نظر آئے اس کی جان بخش دی جائے اور دشمن کے کیمپ میں مسلمانوں کے مال اور عصمت کو بچایا جائے۔ لیکن ہندو اس کے دائرۂ ترحم سے باہر تھے۔''

جادوناتھ سرکار کی معلومات کا ذریعہ مشتبہ ہے۔ اورنگ زیب کا اپنا مکتوب اصل بات سامنے لا رہا ہے کہ اس کا حکم مسلمانوں کے لئے مخصوص نہ تھا۔ بلکہ وہ جسونت سنگھ اور اس کے لشکریوں کا عمومی ذکر کرتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں: ''میں بڑی آسانی سے جسونت سنگھ اور اس کے لشکریوں کا تعاقب کر کے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ ...''

اس کے خط سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کے مقابل فوج جسونت سنگھ کے کمان میں تھی کیونکہ برنیئے کے بقول قاسم خان لڑائی چھڑتے ہی میدانِ جنگ سے بھاگ گیا تھا۔ چنانچہ رہ جانے

والی فوج، سنگھ کے کمان میں لڑ رہی تھی۔ شجاع کے نام مراد بخش کے خط سے واضح ہوتا ہے کہ کون سے دستے کس کی کمان میں تھے، بلا شبہ سادات، راجپوت، افغان اور مغل سبھی دستوں کی قیادت جسونت سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔[۳۴] اسے اگر اورنگ زیب کے خط کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو کوئی ابہام باقی نہیں رہتا اور جادو ناتھ سرکار والی تاریخ نویسی کے چہرے سے نقاب اُتر جاتا ہے۔ معاملہ کچھ بھی ہو، جادو ناتھ سرکار کو یاد نہیں رہتا کہ جسونت سنگھ نے اورنگ زیب کو باپ کے پاس جانے سے روکتے ہوئے ہتک آمیز رویہ بھی اپنایا اور دارا شکوہ کی طرف سے اس سے عملاً لڑنے بھی آیا۔ اگر اورنگ زیب واقعی متعصب اور سنگدل انسان تھا تو اس کا جسونت کو چھوڑ دینا جبکہ وہ کافر بھی تھا اور شہزادے کے سامنے بے بس ہو گیا تھا، اور بعد میں اسے اہم انتظامی عہدوں پر فائز کرنا تو کچھ اور ہی ظاہر کر رہا ہے۔ لیکن متعصب دل فیاضیوں کو تسلیم نہیں کیا کرتا، بلکہ یہ ہمیشہ دلی ارادوں اور افعال و واقعات کا من پسند مطلب ہی نکالتا ہے۔

اس دوران میں شاہ جہاں کو حالات کی سنگینی کا احساس ہو گیا کہ پانسہ پلٹ گیا ہے۔ اس نے دارا کو سمجھایا کہ بھائیوں کو آگرہ آنے دے، لیکن اُس نے التفات نہ دکھائی۔ ہندو اپنے خوابوں کی تکمیل کی خاطر اس پر اپنی گرفت مضبوط کئے جا رہے تھے۔ اس موقع پر اورنگ زیب پھر کوشش کرتا ہے کہ باپ کو قائل کرے کہ وہ خود مداخلت کرے اور اس طرح خوں ریزی کے خطرے کو ٹال دے۔ اس نے شاہ جہاں کو دو خط لکھے۔ پہلا خط جعفر خان لے کر گیا۔ لیکن اس وقت تک شاہ جہاں اپنا سارا وزن دارا شکوہ کے پلڑے میں ڈال چکا تھا۔ اس نے خط کے مندرجات پر توجہ ہی نہ دی، بلکہ دارا کی فوجوں کو رخصت کرتے ان کی کامیابی کے لئے خصوصی دعا کی۔ اورنگ زیب نے دوسرا خط اس وقت لکھا جب دارا شکوہ کا لشکر جرادھول پور پہنچ گیا تھا۔ وہ پھر باپ سے گزارش کر رہا تھا کہ دارا شکوہ کو اس کے خلاف جنگ سے روکے، بصورتِ دیگر دارا شکوہ

کے لئے شکست سے بچنا ممکن نہیں ہوگا۔[35]

وہی ہوا کہ دارا شکوہ نے شکست کھائی اور آگرہ کی طرف بھاگا۔ وہ اپنی زندگی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، لیکن شاہ جہاں کی اس بڑے بیٹے کی محبت میں بے قرار تھا۔ اس نے سونے جواہرات سے دارا شکوہ کی مدد کی۔ مزید یہ کہ اس نے صوبوں کے گورنروں کو لکھا کہ دارا شکوہ کی مدد کو پہنچیں۔ لیکن قسمت کی بازی پلٹی اور شاہ جہاں اورنگ زیب سے ملاقات پر مجبور ہوا۔ اس نے آمادگی کی اطلاع دینے کے لئے فضل خان اور سیّد ہدایت اللہ کو اورنگ زیب کے پاس بھیجا۔ اورنگ زیب نے ہامی بھرلی کہ جنگی صورتِ حال معمول پر آتے ہی وہ باپ سے ملنے پہنچ جائے گا۔

شاہ جہاں کچھ انتظار کرسکتا تھا لیکن اب اسے ملاقات کی بے چینی لگی ہوئی تھی۔ اس سے اورنگ زیب کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ اگر وہ قلعہ میں داخل ہوتے ہی قتل کردیا گیا تو؟ شاہ جہاں کے نام اس کے ایک خط میں ان اندیشوں کا اظہار موجود ہے:

> ''میری انسانی کمزوریاں اور میرے اندیشے اور شبہات جو میرے ذہن پر یورش کررہے ہیں، مجھے حوصلہ نہیں دے رہے کہ میں اعلیٰ حضرت کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کروں ... تاہم اگر میری ذاتی تسلّی کی خاطر آپ میرے کچھ دستوں کو قلعے میں داخل ہونے اور دروازوں پر متعین ہونے کی اجازت مرحمت فرمادیں ... تو میں ضرور حاضر ہوں گا اور آپ کے پائے مبارک چوم کر معذرت خواہی کروں گا۔''[36]

اورنگ زیب کے اندیشے بلاوجہ نہ تھے۔ ماضی میں تو اس کی بار بار درخواستوں پر بھی باپ

ملاقات پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا، کیونکہ وہ پوری طرح داراشکوہ کے ساتھ تھا۔ اب وہ خط در خط لکھ کر ملاقات کے لئے اتنا بے چین کیوں ہو رہا ہے؟ یہاں سینور امنوچی کی گواہی، جو دل و جان سے داراشکوہ کا حمایتی تھا، سمور گڑھ میں اس کے فوج کے ساتھ تھا، قابل توجہ ہے۔ منوچی کہتا ہے کہ شاہ جہاں، دراصل اورنگ زیب کو قوی الاعضاء تاتاری، قلمک اور اُزبک خواتین کے ہاتھوں قتل کرانا چاہتا تھا۔

فرانسیسی سیاح برنیئے نے بھی اپنے سفرنامے میں ایسی ہی بات لکھی ہے۔ محل کے اندر کی بات اورنگ زیب کی چھوٹی بہن روشن آراء جان گئی تھی اور اسی نے بھانڈا پھوڑا اور بھائی کو باپ کے ارادوں سے خبردار کر دیا۔ اورنگ زیب کو یقین ہو گیا کہ جب تک باپ کے ہاتھ میں استعمال کے لئے طاقت اور وسائل ہیں، وہ داراشکوہ کی معاونت سے باز نہیں آئے گا۔ دانش اور تجربہ تقاضا کر رہے تھے کہ وہ قلعہ آگرہ کو شاہ جہاں کے آدمیوں سے خالی کرانے کا مطالبہ کرے۔ یہ ساری باتیں جان کر بھی سیکولر حضرات اورنگ زیب کو ظلم و زیادتی کا الزام دیتے ہیں۔ اورنگ زیب کی جگہ کوئی بھی دوسرا شخص ایسے حالات میں کیا کرتا؟

جی ہاں! اورنگ زیب نے آگرہ کا قلعہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن اس کے باوجود کہ شاہ جہاں نے اس کے لئے سخت مخاصمانہ صورتِ حال پیدا کر دی تھی، اس نے باپ سے نرمی اور مہربانی کا سلوک روا رکھا۔ اس سے کم تر اخلاق والا اُس کا کوئی دوسرا بھائی، اس کیفیت کو انتقام کا بہانہ بنا لیتا۔

برنیئے اس واقعے کے تذکرے میں اورنگ زیب کے رویے کو باپ کے حق میں غیر پسرانہ اور ظالمانہ قرار دیتا ہے۔ لیکن وہ واقعاتِ ماسبق جو اس حادثے کا سبب بنے، بیان نہیں کرتا۔ سچ یہ ہے کہ جب شاہ جہاں نے شہد میں کھلے اندازِ گفتگو سے اورنگ زیب سے ملنے کی خواہش کا اظہار

کیا: زُود آئی، دلِ تنگ مارا مانُوسِ جاں باش، یعنی جلد آ جا، اور میرے بھینچے ہوئے دل کے لئے راحتِ جان بن جا۔

لیکن قلعہ میں اورنگ زیب کے جانے سے پہلے ہی اس کے ماموں شائستہ خان اور شیخ میرا سے روکنے میں کامیاب ہوگئے۔ جس واقعے نے حتمی فیصلہ کرنے میں مدد دی، وہ ناہر دل خان چیلہ نامی شخص کا پکڑا جانا تھا، جو شاہ جہاں کا خط دارا کے پاس لے جا رہا تھا۔ بادشاہ نے دارا شکوہ سے دارالحکومت میں رُکنے کے لیے کہا تھا کہ سیم وزر اور فوجوں کی کوئی کمی نہیں: ''میں یہ معاملہ یہیں ختم کردوں گا۔'' بات واضح ہے کہ اس کے ارادے اورنگ زیب کو قتل کرنے کے تھے۔

والی کابل مہابت خان کے نام خط میں شاہ جہاں، دارا شکوہ کے لئے محبت کے گہرے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ بیٹے دارا شکوہ کو 'دارائے من' (میرا دارا) کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ اگرچہ سرکاری مکتوب تھا، خصوصی حالات میں لکھا گیا تھا اور اس طرح کے اظہارِ محبت کے لئے موزوں نہ تھا- لیکن شاہ جہاں دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔

برنیئے کو اس پورے قصے پر اعتراض ہے۔ یہاں بھی اس کا سارا بیان سوائے قیاس کے کچھ نہیں، جس میں تاریخ نویسی والی کوئی خوبی نہیں۔ کہتا ہے: ''بہت سے 'ذہین لوگ' ان الزامات کی صداقت کا انکار کرتے ہیں کہ یہ خط جسے اس انداز سے عام کیا گیا، لوگوں کو دھوکا دینے کی ایک کوشش تھی ....'' لیکن برنیئے اُن ''ذہین لوگوں'' میں سے کسی ایک کا بھی نام نہیں بتاتا جنہیں وہ جانتا ہو۔

تیورنیا (Tavernier) شاہ جہاں کا خط پکڑے جانے کا ذکر ہی نہیں کرتا، جس نے باپ سے ملنے کے ضمن میں اس کے ارادے بدل ڈالے۔ اس کے خیال میں اورنگ زیب طاقت کے میدان کا کھلاڑی ہے، بہت سرد مزاج اور انتہائی چالاک فتنہ پرداز۔ لیکن یہ کہ وہ ایک بیٹا بھی

تھا، ایک بندۂ مومن بھی اور آخر کو انسان تھا۔ یہ سب پہلو برنیئے کے نزدیک قابل توجہ اُمور ہیں ہی نہیں۔

ان خطوط کی بناء پر اورنگ زیب کو یقین ہو گیا تھا کہ باپ اسے قتل کر دے گا۔ چنانچہ اس کا فیصلہ تھا کہ داراشکوہ کی رخصتی لازم ہے۔ اس کا تختِ دہلی کا ہندو پسند دعوے دار کے طور پر موجود ہونا، سلطنت میں فتنہ و فساد کا باعث تھا۔ بلکہ جنوبی ایشیا میں مسلم اقتدار کو ختم کرنے کا باعث بن سکتا تھا۔ اس طرح مجبور ہو کر اس نے شاہ جہاں کا ذاتی سٹاف اس کے پاس سے ہٹا دیا، اور اس کے گرد ایک نیا انتظامی ڈھانچا قائم کر دیا۔ یہاں اورنگ زیب کا ایک خط جو اس کے مجموعۂ مکاتیب میں موجود ہے، لازماً زیرِ نظر رہنا چاہیے:

> ''میں اعلیٰ حضرت سے بار بار درخواست کرتا ہوں کہ یہ آگ بھڑکانے والے خطوط نہ لکھے جائیں ... اب میں بے بس ہو گیا ہوں۔ میں ان فتنہ پرداز خواجہ سراؤں کو آپ کے سٹاف سے فارغ کر رہا ہوں .... میں کئی دفعہ یہ یقین دہانی بھی کرا چکا ہوں کہ آگرہ کی طرف بڑھتے ہوئے میری ذرا بھی خواہش نہیں تھی کہ میں شاہِ اسلام سے تخت و تاج چھین لوں۔ میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں کہ ایسا بُرا خیال میرے ذہن میں آیا ہی نہیں۔
>
> ''آپ کی علالت کے ابتدائی ایام میں جب بڑے شہزادہ نے، جس میں ایک مسلمان کے شریفانہ کردار کا ذرہ بھر نقش موجود نہیں، اقتدار ہاتھ میں لیا اور الحاد اور بے دینی کا علم بلند کیا تو میں نے اسے اپنی اسلامی ذمہ داری سمجھا کہ اسے مسندِ اقتدار سے اُتار پھینکوں۔ چونکہ آپ عالی وقار کا ایک ہی

> جانب جھکاؤ رہا، حالات کی سنگینی کا احساس نہ کر پائے اور بڑے شہزادے کو
> بے دینی پھیلانے کی آزادی دیے رکھی۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ اس کے
> خلاف جہاد کروں۔"

وہ تشویشناک صورتِ حال کیا تھی جو اورنگ زیب کے ذہن کو پریشان کر رہی تھی؟ یہ ہندستان نامی غیر مسلم سمندر میں مسلم اُمہ کے مستقبل کا سوال تھا۔ مسلمان ایک دوسرا اکبر نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ داراشکوہ کی تخت نشینی سوسائٹی اور مملکت کے اسلامی خدوخال مٹا کر رکھ دیتی۔ بلکہ مملکت، مسلم حمایت سے محروم ہو جاتی، جو اس کے وجود اور تسلسل کا بڑا ذریعہ تھا۔ حکیم الامت اقبال نے تقریباً یہی بات فرمائی تھی۔

تخمِ الحادے کہ اکبر پرورید
باز اندر فطرتِ دارا رمید

اکبر نے الحاد کا جو بیج بویا وہ دارا کی شکل میں دوبارہ پھوٹ پڑا۔

اورنگ زیب کے ارادوں کا پتہ شاہ جہاں کے نام اس کے ایک اور خط سے بھی ہوتا ہے:

> "جب تک طاقت اور اختیار آپ کے مبارک ہاتھوں میں رہا، آپ کی اطاعت مجھ پر لازم تھی۔ اللہ بزرگ و برتر گواہ ہے کہ میں نے اپنی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔ لیکن جب آنجناب بیمار پڑ گئے تو شہزادے (دارا) نے آپ کے اختیارات سلب کر لیے۔ اس نے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کی جگہ ہندوؤں کا بت پرستانہ مذہب پھیلانا شروع کر دیا، جس سے سلطنت میں بے چینی پھیل گئی۔

''اپنے آپ کو حقیقی جانشین سمجھ کر اُس دارا نے آپ کو بادشاہی سے معزول کر دیا، جس کا میں نے گزشتہ خطوط میں ذکر کیا.... چنانچہ میں برہان پور سے چل پڑا کہ کہیں یومِ آخرت اللہ تعالیٰ مجھے ذمہ دار نہ ٹھہرائے کہ میں نے فساد کو کیوں نہیں دبایا۔

دوسرے خطوط کی طرح اس خط میں بھی اورنگ زیب اپنی کامیابی کو اللہ کی عطا کردہ بتاتا ہے، جو اُس کے مومن بندوں کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ باپ سے پوچھتا ہے کہ اگر آپ کی مدد سے داراشکوہ کامیاب ہو جاتا ہے، تو کیا صورتِ حال بن جاتی؟ کیا اس سے مسلمانوں پر تباہی نہ آ جاتی اور دنیا بے نور نہ ہو جاتی؟ اس کے باوجود باپ کے لئے محبت اور احترام کا جذبہ اس کے دل میں موجزن رہا۔ اس خط میں وہ لکھتا ہے:

''ان حالات میں اللہ تعالیٰ کی عنایات پر شکر گزار ہوں جو مجھ پر ہوئیں۔ آپ نے میری تعلیم و تربیت اور نگہداشت کے لئے جو کچھ کیا اس پر اظہارِ تشکر بھی میرے لئے ممکن نہیں۔ میں کسی صورت اس سعادت سے محروم نہیں ہونا چاہتا، نہ میں اپنے فرائض سے کوتاہی کا ارتکاب گوارا کر سکتا ہوں۔ نہ میں اس مختصر عرصۂ حیات کی خاطر اپنے آپ کو اجازت دوں گا کہ آپ کے احساسات کو ذرا بھی ٹھیس پہنچ پائے۔ جو کچھ پیش آیا وہ اللہ کی مشیت تھی اور اسی میں قوم اور سلطنت کے لئے خیر اور بھلائی ہے۔''

یہ ایک عظیم بادشاہ کا اپنے ''قیدی'' باپ کے نام خط ہے۔ اس میں پسرانہ جذبات ہیں، وہ باپ کو تسلی دے رہا ہے کہ اللہ کی مشیت اور رضا کے سامنے سر جھکا لے اور دل میلا نہ کرے۔ فی الاصل یہ حالات کو معمول پر لانے اور مصالحت کی ایک پیشکش تھی، تا کہ محبت اور اعتماد کی فضا

بحال ہو۔ اس سے اسلام کے لئے اس کی گہری محبت کا اظہار بھی ہوتا ہے اور یہ کہ اسے مسلم اُمت اور مملکت کے متعلق کیا اندیشے لاحق تھے ان سے بھی آگاہی ہوتی ہے شاہ جہاں جو ہمیشہ ہی ایک مشکل باپ بنا رہا، آمادہ نہیں ہو رہا تھا کہ نظام کی اصلاح ہو اور معاملات پھر سے ٹھیک ہو جائیں۔

انسان جب اُن حالات کو دیکھتا ہے جن میں اورنگ زیب پھنس چکا تھا اور ساری موجود شہادتوں کا جائزہ لیتا ہے تو اُسے حیرت ہوتی ہے کہ آخر اُس نے باپ سے وہ کیا بُرا سلوک کیا، جس کا الزام اُسے ہندو، یورپی اور سیکولر مؤرخین اور تجزیہ نگار دیتے ہیں۔

طرفہ تماشہ یہ ہے ک تخت شاہی سے تو شاہ جہاں کو بڑے بیٹے داراشکوہ نے اُتارا تھا، نہ کہ اورنگ زیب نے، جو آخری گھڑی تک باپ کے احترام میں دوسرے بھائیوں کے برعکس تخت پر بیٹھنے سے انکار کرتا رہا۔ اگر اس نے قلعہ میں داخلے کے مقامات پر محافظ بٹھا دیے تھے یا شاہ جہاں کو گھیرے رکھنے والے خواجہ سراؤں کو نکال دیا تھا، تو اس میں کون سی ایسی بُری بات تھی؟ سیکولر دانش ور شاید یہی سمجھتے ہیں کہ آگرہ کا قلعہ بھی لاہور یا اٹک قلعوں کی طرح کا کوئی قید خانہ تھا۔ حقیقت اس سے بالکل مختلف تھی۔ سچ یہ ہے کہ قلعہ کے اندر موجود شاہی محل مرتے دم تک شاہ جہاں کے قبضہ میں رہا۔ برنیئے کا اظہارِ عداوت و خصومت اُسے یہ ماننے کی اجازت دے دیتا ہے کہ اگرچہ شاہ جہاں کی رہائش گاہ پر محافظ بٹھا دیے گئے تھے، لیکن اورنگ زیب ہمیشہ باپ سے عزت و احترام سے پیش آیا اور اُسے ''عیش و تنعم اور توقیر سے نوازتا رہا۔'' برنیئے کی گواہی یہ بھی ہے کہ شاہ جہاں نے جو کچھ مانگا اورنگ زیب نے مہیا کر دیا: ''اُس نے اُسے تحائف سے لاد دیا۔ ایک فال گر کاہن کی طرح اُس سے مشورے لیتا رہا اور اس کے باپ کے نام لکھے گئے خطوط سے فرض شناسی اور اطاعت گزاری کا اظہار ہوتا ہے۔''

اورنگ زیب نے ان جذبات اور فیاض رویّوں کا برتاؤ اس والد کے ساتھ کیا، جس نے جواب میں پدرانہ شفقت سے ہاتھ اُٹھا لیے تھے، جو اُسے ختم کرنے کے لئے پہلے داراشکوہ سے ملا رہا، پھر خود قلعہ میں اس کو موت کے گھاٹ اُتارنے کی منصوبہ بندی کی، بلکہ مُراد کو بھی اُکسایا کہ اُسے قتل کر دے۔ شاہ جہاں کا مراد کے نام خفیہ خط جسے اورنگ زیب کے چست اور بیدار خفیہ کاروں نے راستے میں اُچک لیا، واقعی ایک متعصب اور مایوس ذہن کی پیداوار ہے۔ پوری سلطنت مراد پر نچھاور کر کے وہ اُسے شہہ دے رہا ہے کہ اورنگ زیب کو کھانے کی دعوت میں بلا کر قتل کر دے۔ خط کے الفاظ خون منجمد کر دینے والے ہیں:

> ''بادشاہی کل ہندوستان باطبیب نفس وتوئی ضمیر بہ آں فرزند سعادت پیوند حوالہ نمودہ ایم۔ برادر زادہ را بہانہ ضیافت بہ خانۂ خود طلب داشتہ کار...''

شاہ جہاں نے یہ سازشی انداز کیوں اختیار کیا؟ ایک پیچیدہ سوال ہے۔ شاید یہ ایک غیر متوازن نفسیات کا مسئلہ ہے۔ بہر کیف اورنگ زیب نے ہر پیمانے سے اپنے آپ کو عظیم ترین مغل حکمران ثابت کیا کہ وہ خود اپنے نام کی طرح تخت شاہی میں جڑا ہوا ہیرا دکھائی دیتا ہے۔ باپ کے متعلق اس کے خدشات بے بنیاد نہ تھے۔ اس امر کے کافی شواہد موجود ہیں کہ باپ کی نگرانی کا فیصلہ اس نے جوابی طور پر خود حفاظتی کے پیش نظر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بقول برنیئے جب اورنگ زیب ابتدائے حکومت میں سخت بیمار پڑا تو اس نے اپنے بیٹے سلطان معظم کو وصیت کی کہ اس کی وفات کی صورت میں وہ اپنے دادا (شاہجہاں) پر سے نقل و حرکت کی ساری پابندیاں اُٹھا دے۔

برنیئے کا مسئلہ اس کا موضوعی مفروضہ (thesis) ہے، جس میں وہ اُلجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کبھار سچ اس کی نوکِ قلم پر آجاتا ہے، لیکن پھر اس کا وہی مفروضہ اُسے کھینچ گھسیٹ کر کیچڑ میں لت پت کر دیتا ہے۔ اب وہ اپنی گزشتہ بات بھول کر اورنگ زیب کے خلاف بے تکی ہانکنے لگتا ہے۔ شومئی قسمت اُس کے پاس اپنی بات ثابت کرنے کے لئے کچھ نہیں۔ گو وہ پوری کوشش کر کے بات بنالیتا ہے، تاکہ وہ اورنگ زیب کے منہ پر ذلت اور رسوائی کے داغ ثبت کر سکے۔ لیکن اپنی ہی ایجاد کردہ خاک میں اپنے آپ کو لتھڑنے کے سوا اُسے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی ہر کوشش کے بعد اورنگ زیب کا چہرہ کچھ اور نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

اپنے ایک خط میں، جس کے متعلق برنیئے کا دعویٰ ہے کہ اس نے خود لکھا ہے، اورنگ زیب کھل کر باپ سے ایک متنازع فیہ بات کرتا ہے۔ برنیئے کے مطابق اس قضیے میں اورنگ زیب عام مغل رواج کے مطابق میت کی جائیداد شاہی خزانے کے لئے ضبط کرنے کے خلاف ہے اور کہتا ہے: ''بے شک یہ طریقہ سودمند ضرور ہے، لیکن کیا اس میں موجود بے انصافی اور ظلم کا ہم انکار کر سکتے ہیں؟''

خط کے مندرجات بتاتے ہیں کہ شاہجہاں نہ صرف مرنے والوں کی جائیداد ضبط کرنے کی تجویز دے رہا ہے، بلکہ سلطنت کی جغرافیائی حدود اور اموال میں اضافہ کی تلقین بھی کرتا ہے۔ مگر اورنگ زیب کا اسلامی ضمیر یہ باتیں گوارا نہیں کرتا۔ سلطنت کی توسیع سے بھی وہ انکاری ہے۔ اس کا خیال ہے: ''عظیم فاتح ہمیشہ عظیم بادشاہ ثابت نہیں ہوئے۔ واقعی عظیم حکمران وہ ہے جو اپنی زندگی کا بڑا مقصد یہ بنائے کہ اپنی رعیت پر عادلانہ حکومت کرنی ہے'' ...

اپنے بارے میں شاہ جہاں کا منفی تأثر زائل کرنے کے لیے وہ کہتا ہے: ''جیسا آپ کا گمان ہے،

تخت پر بیٹھنے کے بعد میں مغرور اور گستاخ نہیں ہوگیا۔ آپ کا چالیس سالہ تجربہ آپ کو بتانے کے لئے کافی ہے کہ تاج شاہی کتنا بوجھل زیور ہے اور عوام کی نظروں سے ہٹتے وقت حکمران کتنا دُکھی اور مغموم ہوتا ہے۔'' ۵۱

قطع نظر اس کے کہ یہ خط اورنگ زیب کے خلاف بدخواہوں کے اُن الزامات کو دفن کردیتا ہے کہ وہ تخت سنبھالنے کے بعد باپ کو قید کرنے اور اس کے ساتھ زیادتیاں کرنے کا مرتکب ہوا۔ تصویر یہ بنائی جاتی ہے کہ باپ جیل میں سڑ رہا ہے، کوئی اُس سے بات نہیں کرسکتا، نہ مل پاتا ہے، واقعات کے اعتبار سے قطعاً نادرست ہے۔ مذکورہ خط اورنگ زیب کی صحیح شخصیت بھی سامنے لاتا ہے۔ باپ بیٹا ایک دوسرے سے صلاح مشورہ کرتے پائے جاتے ہیں۔ جہاں وہ اپنے باپ سے اختلاف کرتا ہے، وہاں دلیل اور بُرہان ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے دوٹوک فیصلے کیے لیکن وہ نہ بدخُو تھا اور نہ ظالم۔ اس کے بیان سے صرف اسلامی جوہر آشکارا ہو رہا ہے، جسے اپنی رعیت کے بہبود کی فکر لاحق تھی اور اس کا یہ عزم تھا کہ وہ عوام کو عدل وانصاف دے گا۔

برنیئے جس طرح اس خط کا اعادہ کرتا ہے، وہ اورنگ زیب کو ایک ایسے بیٹے کے طور پر قطعاً پیش نہیں کرتا، جو اپنے والد سے خطاب میں بہت محتاط اور مؤدب ہے۔ اس کے برعکس ''رُقعاتِ عالمگیر'' ہمارے ذہنوں میں ایسے بیٹے کا تصور بٹھاتا ہے جو والد کے احترام کا بے حد خیال رکھتا اور اپنے بیان میں بیچ بیچ میں گہری احترامی کیفیت اور اطاعت کے الفاظ استعمال کرتا جاتا ہے۔ مثلاً وہ اکثر و بیشتر باپ کو خطاب کرتے ہوئے ''پیر و مرشد''، ''قبلہ وکعبہ''، ''قبلۂ دین و دنیا''، ''قبلۂ جہاں وجہاں سلامت''، ''اعلیٰ حضرت''، ''مرشدِ کامل سلامت'' جیسے القاب استعمال کرتا ہے۔ جبکہ اپنی ذات کے لئے ''مرید فدوی'' اور ''مرید عقیدت کیش'' جیسے الفاظ ہی مناسب سمجھتا ہے۔

چنانچہ قواعد کو تجزیے کی سان پر چڑھا کر دیکھیں تو برنیئے کی تحریر تضاد بیانی کا مرقع ہے، جس میں مذکورہ القابات جگہ نہیں پاتے، جبکہ یہ اورنگ زیب کا اپنے والد کے لیے مخصوص طرزِ تحریر ہے۔ برنیئے کا مقصد ایک ہی لگتا ہے کہ باپ کے ضمن میں اورنگ زیب کی سختیوں کے متعلق اپنے مفروضے کو درست ثابت کردے۔ حقیقی تاریخ نویسی کے معاملے میں برنیئے شہادت کے بارے میں محتاط نہیں ہے، وہ واقعات کی توضیحی تشکیل میں مصروف رہتا ہے۔ اور حقائق کے بجائے اپنے ذاتی تصورات سے سارا بیانیہ مرتّب کرتا ہے۔ اس کا بیان کو واقعات کی من مانی تشریح تو کہا جا سکتا ہے، لیکن اسے وہ ٹھوس شہادت نہیں کہا جاسکتا کہ جس پر ایک راست مقدمے کی بنیاد اٹھائی جاسکے۔

ارتداد کا راستہ روکنا

برنیئے کی اطلاع ہے کہ داراشکوہ کی موت علما کی ایک مجلس کے اجتماعی فیصلے یا فتوے کے نتیجے میں ہوئی تھی، نہ کہ اورنگ زیب کے شاہی فرمان کے نتیجے میں۔[۵۲] علما کی مخاصمت کی وجہ ظاہر ہے داراشکوہ کے کافرانہ عقائد تھے، جن کا وہ اپنے آغازِ جوانی سے برملا اظہار کر رہا تھا۔ اس نے سات کتابیں لکھیں جن میں دو اشتراک سے لکھی گئیں، نیز اُپنشد کا فارسی ترجمہ کیا۔ چنانچہ اشرافیہ کی اکثریت، علمائے کرام اور عوام الناس میں اس کے کفریہ عقائد کا چرچا تھا۔

جس چیز نے داراشکوہ کے خلاف مخالفانہ جذبات کو زبان بخشی اور اس مزاحمت کو اتحاد میں پرودیا، وہ داراشکوہ کی مسلم ہند کے تخت پر بیٹھنے کی خواہش تھی۔ یہ ایک وسیع اتحاد تھا، ہدف یہ تھا کہ اکبر کا الحادی دور دوبارہ نہ آنے پائے۔ مجدّد الف ثانی کی تحریک نے اورنگ زیب کو مجبور کیا کہ وہ داراشکوہ کے خلاف فوجی محاذ پر لیڈر کا کردار ادا کرے۔ شاید کم لوگوں کو علم ہو کہ اورنگ زیب مذکورہ تحریک کا

نمایاں کارکن تھا، جس نے حضرت احمد سرہندیؒ مجدد الف ثانی کے فرزند ارجمند اور خلیفہ خواجہ معصومؒ کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کی تھی۔ [۵۴]

برنیئے کا مدیر کانسٹیبل (Constable) منوچی کے حوالے سے بتاتا ہے: ''عیسائی جذبات جن کے ذریعہ مشنری پادریوں نے کوشش کر کے اسے (یعنی دارا کو) سرگرم کیا تھا، اس کی زندگی کے آخری لمحات میں بیدار ہو گئے تھے۔'' موت سے پہلے اُسے کہتے سنا گیا:

''محمدؐ مارہ ملکو شد، ابن اللہ مریم ی باشید [محمدؐ مجھے موت دے رہا ہے، جبکہ ابن اللہ اور مریم مجھے نجات دلائیں گے]'' [۵۵]

ہمیں یقین نہیں کہ دارا کا سر اورنگ زیب کو دکھایا گیا تھا یا نہیں۔ برنیئے کا بیان ہے کہ سر بادشاہ کے پاس لایا گیا۔ اس نے پانی منگایا، سر دھویا اور چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ بھائی کے انجام پر رو دیا اور کہا: ''آہ، بدبخت! یہ منظر میری آنکھوں کو مزید اذیت نہ دے۔ یہ سر لے جاؤ اور مقبرۂ ہمایوں میں دفن کر دو۔'' [۵۶] اگر اورنگ زیب اتنا ہی ظالم اور سخت گیر تھا، جیسے کہ الزام دیا جاتا ہے تو خود اپنے بھائی کے انجام پر وہ رو کیوں رہا تھا؟ اور سب کو چھوڑ کر اس نے کٹا ہوا سر خود کیوں دھویا؟ کیا ظالم اور سنگ دل انسان کا رویہ ایسا ہی ہوتا ہے؟

داراشکوہ مرتد تھا، جو ہندو مدد اور عیسائی مشینریوں، تجار اور کرائے کے قاتلوں کی در پردہ تائید حاصل کر کے لوگوں کی اسلامی روح کچلنا چاہتا تھا۔ اورنگ زیب نے مسلم عوام کی مضبوط حمایت کے ذریعے اس کا مقابلہ کیا۔ تاہم دارا آخر بھائی تھا۔ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے والے شہزادے کے انجام پر فطری طور پر آبدیدہ تھا، لیکن ان احساسات کے علی الرغم اُسے کچھ اور کرنا پڑا۔ کیونکہ نہ قانونِ شرع کا کوئی ضابطہ اجازت دے رہا تھا اور نہ سلطنت کی سلامتی کے حوالے

سے یہ بات قابل قبول تھی کہ کفر اور ارتداد کو سزا دیے بغیر بچ جانے دیا جاتا۔ جس حوالے سے بھی دیکھیں، داراشکوہ مسلم تشخص کے تزویراتی (strategic) تقاضوں کے لئے خطرہ بن گیا تھا۔ وہ مسلمان جو اقلیت میں ہونے کے باوجود ہندوستان کے حکمران تھے- یہاں پر ایک اور حیرت انگیز بات پیش نظر رہنی چاہیے، اور وہ یہ کہ اورنگ زیب سے پہلے بھی برادر کشی کی جنگیں ہوئیں اور خون بہائے گئے۔ ان سب میں صرف اورنگ زیب کو خنجر آزمائی کے لئے منتخب کرنا خاص مقصد اور ارادے کا پتہ دیتا ہے۔

قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ جانشینی کی جنگ داراشکوہ نے شروع کی تھی۔ عملاً آگرہ میں ڈیرہ ڈال کر باپ کو تنہا کر دیا تھا (برنیئے کہتا ہے "قید کر دیا تھا")۔ باپ کے جعلی دستخط کیے اور جسونت سنگھ کی کمان میں متحدہ افواج کو مسلمانوں سے لڑنے بھیجا۔ اس کے باوجود دارا تو بے قصور ہے، خوش اطوار ہے، اعلیٰ حسّیات کا مالک اور عقل و دانش میں پورا صوفی بزرگ ("مرشدِ باصفا") اور جانے کیا کیا ہے۔

شہزادہ مراد کے معاملہ میں بھی جھوٹ کی آمیزش ہے۔ اورنگ زیب نے اُسے بھی قتل نہیں کیا تھا۔ بلکہ دونوں بھائی داراشکوہ اور اس کے ہندو مشرکانہ عقائد کی ترویج کے خلاف صف آراء تھے۔ کئی مؤرخ بتاتے ہیں کہ مُراد مزاجاً تند و تیز تھا، شرابی اور خوشامد پسند تھا۔ اس پر اس کی جرأت اور حوصلہ مندی نے مہمیز لگائی۔ مفاد پرستوں کے گھیرے میں آ کر وہ جلد ہی ان کے سازشی چکروں میں آ گیا۔

اورنگ زیب سے معاہدہ کے نتیجہ میں اُسے کابل، لاہور، کشمیر، ملتان، بھکر، ٹھٹھہ سے لے کر خلیجِ اومان تک حکمرانی کے لئے وسیع علاقہ مل گیا تھا[۵۷]۔ لیکن اس کی ذہانت کے مقابلے میں اس کے

لمبے چوڑے ارادے اور حوصلے اسے لے ڈوبے۔ اورنگ زیب سے تعاون کے عہد و پیمان کو پسِ پشت ڈال کر اس نے شاہ جہاں سے تعاون کی پینگیں بڑھائیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ شاہ جہاں اور نگ زیب کے معاملات اُلجھے ہوئے ہیں اور معاملہ اورنگ زیب کی فتح کے بعد بھی ختم نہیں ہوگا، اپنے لئے خصوصی معافی کا خواست گار رہوا۔ شاہ جہاں نے بھی معذرت قبول کر کے معافی دے دی اور ساتھ ہی پورے مسلم ہندستان پر اس کا حقِ حکمرانی بھی تسلیم کر لیا۔ اہم ترین بات یہ تھی کہ یہاں پر بھی شاہ جہاں نے اُسے اورنگ زیب اور اس کے بیٹوں کے قتل کا مشورہ دیا۔

یہ وہ دن تھے جب آگرہ پر اورنگ زیب نے کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ اس نے زخمی مراد کو صحت یابی کے لئے پیچھے چھوڑا اور خود دارا شکوہ کے تعاقب میں چل پڑا، جو دہلی میں ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا۔ لگتا ہے بیٹے (دارا) اور باپ کی یکجائی انہیں اورنگ زیب کے خلاف سازشوں کا موقع دے رہی تھی۔ اس موضوع پر اورنگ زیب کے خطوط کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ مراد کے خدشات جو اورنگ زیب کے ارادوں کے متعلق اس کے ذہن میں جنم لے سکتے تھے، ختم کرنے کے لئے اورنگ زیب نے اُسے دو سو گھوڑے اور بیس لاکھ روپیہ بھیجا۔ ساتھ ہی یہ یقین دہانی بھی کرا دی کہ دارا کا معاملے کامیابی سے سلجھاتے ہی اُسے واپس اپنے موعودہ علاقوں کی طرف جانے کی اجازت ہوگی۔

لیکن مطلق بادشاہی کے خواب مُراد کو اندھا کر چکے تھے۔ اس نے شاہجہاں کی بات مان لی اور تختِ شاہی پر اپنے دعوے کا اعلان کر دیا۔ اس صورتِ حال نے اورنگ زیب کو دکھی اور آزردہ کر دیا۔ اُسے نتائج کا خوف لاحق ہوگیا کیونکہ اب تین حریف اس کے سامنے تھے۔ چنانچہ اس نے خطرے کو سر اُبھارنے سے پہلے کچل دیا۔ مراد کو پکڑ کر گوالیار کے قلعے میں ڈال دیا۔ وہاں اسے

فیاضانہ عطیات سے نوازا گیا۔ اس کا گھرانہ اس کے ساتھ رہا اور اس کی خاص محبوبہ سرستی بائی اس کی دسترس میں رہی۔ لیکن مراد کی بگڑی نفسیات کو چین نہ آیا، اس نے فرار کی کوشش کی۔ اُسے اس وقت گرفتار کرلیا گیا جب وہ اپنی محبوبہ سے رخصت ہو رہا تھا۔ اورنگ زیب اُسے قتل کرسکتا تھا، لیکن اس نے اس کے خون سے ہاتھ رنگنا پسند نہ کیا۔ اُسے چار سال تک حفاظتی حراست میں رکھا گیا۔ یوں اُسے اچھی خاصی مہلت دی گئی کہ وہ کوئی فیصلہ کرسکے۔

تاہم جب اورنگ زیب سریر آرائے سلطنت ہوا تو قاضی کی عدالت میں مراد کے خلاف قصاص کا مقدمہ دائر ہوگیا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے اپنے وزیر سیّد علی نقی کو قتل کردیا تھا۔ یہ مقدمہ مقتول کے بیٹے کی استدعا پر قائم ہوا تھا۔ عدالت نے علی نقی کے بیٹے کو دیت قبول کرنے پر آمادہ کرنا چاہا، لیکن وہ قصاص (خون کے بدلے خون) پر اڑا رہا۔ اورنگ زیب کو اس کے خلاف قصاص کا مقدمہ اچھا نہ لگا۔ اس نے مقتول کے بیٹے کے سامنے ناراضی کا باقاعدہ اظہار کیا۔ خافی خان کا حوالہ میاں محمد نے دیا ہے کہ ''مغضوب النظر بادشاہ گردید'' (بادشاہ کی نظروں میں مغضوب ٹھہرا)۔[۵۸] کچھ لوگ کہیں گے کہ اورنگ زیب قاضی کے فیصلے کو ختم کردیتا۔ ہاں، وہ کرسکتا تھا، لیکن اس نے نہیں کرنا تھا۔ بطور ایک مسلمان کے، جس کی نظر میں اہمیت شریعتِ الٰہی کی تھی اور عدالتی فیصلے کا احترام تھا، اسے معاملے سے دور ہی رہنا تھا۔ دل میں وہ بے شک کڑھتا رہتا اور غم سے گھلتا رہتا، لیکن اس نے قانون کو راستہ دینا تھا کہ وہ اپنا آپ منوائے۔

اورنگ زیب کو بدنام کرنے کے لئے برنیئے کہانی بُنتا ہے کہ مراد کے ساتھ دھوکا کیا گیا اور اسے دارا کو ختم کردینے کے بعد بادشاہ بنانے کا وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ برنیئے کی دلیل یہ ہے کہ جب دارا کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کے لئے اورنگ زیب کوشاں تھا تو اس نے مراد سے وعدہ کیا تھا کہ کامیابی کی صورت میں سلطنت اُسے ملے گی۔ لیکن یہاں پھر برنیئے کی زنبیل چالبازیوں سے

بھری ہوئی ہے اور وہ منہ بھر بھر کر جھوٹ بولتا ہے۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دستاویز سامنے نہیں لاتا۔ بس دونوں کے درمیان معاہدے کی اپنی تاویل بیان کرتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے چھوٹے بھائی کو ''اعلیٰ حضرت'' کہہ کر مخاطب کیا تھا[۵۹]۔ کیونکہ طے شدہ برتر مرتبے کا ادب ولحاظ اسے کرنا تھا۔

خوش قسمتی سے معاہدے کا متن اورنگ زیب کے مکاتیب کے مجموعے میں موجود ہے، جس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ دارا کا معاملہ نمٹانے کے بعد وہ اپنے تفویض شدہ علاقوں پر حقِ حکمرانی رکھے گا۔ معاہدے میں من جملہ یہ بھی ہے کہ دونوں بھائی اکٹھے رہیں گے۔ اورنگ زیب کے سامنے مراد نے جو اقرار کیا کہ اس ''دشمنِ دین و جان (دارا)''[۶۰] کو ختم کرنے کے بعد وہ ہمیشہ اور ہر جگہ اورنگ زیب کا ساتھ دے گا، اور وہ اپنے طے شدہ علاقوں کے علاوہ اور کچھ طلب نہیں کرے گا۔

مراد کے اس عہد کے جواب میں اورنگ زیب کہتا ہے کہ: جب تک ''عزیز تر از جان'' بھائی مخلص رہے گا، ہماری بخشش اور عنایات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ہماری باہمی محبت اور توجہ اپنے مقاصد کے حصول اور دارالشکوہ لعین کا کانٹا نکال دینے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ شدت سے جاری رہے گی۔ اس کے ایک سنجیدہ مقصد کے طور پر یہ عہد بھی اس میں درج ہے کہ: سیّد المرسلین محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کے قیام اور سربلندی کے لئے اور دارالاسلام سے زندقہ والحاد کو اُکھاڑ پھینکنے کی کوشش جاری رہے گی۔ عہد نامے میں دو آیات قرآنی کا حوالہ موجود ہے، جن میں عہد کی پابندی پر زور ہے۔ دستاویز کا سرنامہ بھی کافی اہم ہے، یعنی: ''عہد نامہ کہ بوجہ التماس بادشاہ زادہ مراد بخش قلمی شد''[۶۱] کہ (عہد نامہ جو بادشاہ زادہ مراد بخش کی درخواست پر لکھا گیا)۔

اب دیکھیے، اس عہد نامے سے کیا بات سامنے آ رہی ہے:

- کہ پہلے ایک زبانی معاہدہ ہوا، جسے مُراد کی خواہش پر ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔
- کہ قول اورنگ زیب نے دیا، جبکہ مُراد کے ساتھ یہ عہد ہو رہا تھا۔

لیکن برنیئے بد دیانتی سے اورنگ زیب کو قابلِ نفریں بنا کر دکھاتا ہے۔ وہ اپنا ہی ایک عہد نامہ ایجاد کرتا ہے اور پھر اس نقل کو اصل کر دکھاتا ہے جس کا الزام اورنگ زیب کے سر پر آتا ہے اور یوں اسے ''برائی کا مجسمہ'' بنا کر پیش کرتا ہے۔

دو شہادتیں ایسی ہیں کہ ان سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ ایک کا ذکر ہو چکا، جس کا تعلق عہد نامہ سے ہے جو اورنگ زیب کو عہد کرنے والا بنا کر اُونچا مرتبہ دیتا ہے کہ وہ دوسروں پر عنایات کرتا ہے۔ اور ان دوسروں میں مراد بخش بھی شامل ہے۔ دوسری شہادت سمور گڑھ کی لڑائی کی کمان ہے۔ سٹینلے لین پول Medieaval India Under Mohammadan Rule (۱۷۱۲-۱۷۶۴) میں لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے لڑائی کی قیادت اپنے ہاتھ میں رکھی، پول کے الفاظ ہیں:

> ''کمان (قلب لشکر) اپنے ہاتھ میں رکھتے ہوئے۔ اس نے مُراد کو میسرہ (بائیں بازو) پر رکھا اور بہادر خان کو میمنہ (دائیں بازو) سونپا۔ اور ہراوّل دستے کے ساتھ اپنے بیٹے محمد کو بھیجا کہ وہ توپ خانے کے ساتھ رہے، جو حسبِ معمول سب سے اگلی صف میں تھا۔'' [۴۲]

لشکر کی یہ ترتیب بتاتی ہے کہ مرکزی کمان اورنگ زیب کے ہاتھ میں رہی، جبکہ مراد کو بائیں بازو میں اضافی کمک والی پوزیشن پر رکھا گیا۔

لڑائی کے بعد اورنگ زیب مُراد بخش اور دوسروں کو انعامات دیتا ہے۔ یہ عطیات قبول کر کے اور عہد نامہ کی درخواست دے کر مُراد اورنگ زیب کے مقابلے میں ثانوی حیثیت تسلیم کرتا ہے اور نہ کہ بادشاہ کی پوزیشن اختیار کرتا ہے، جیسا کہ برنیئے دعویٰ کرتا ہے۔

زیرِ بحث قضیے کے تین مفروضے

اب تک جو کچھ ہم عرض کر چکے ہیں، اس سے تین قابل ذکر مفروضے (thesies) سامنے آتے ہیں: یہ کہ اورنگ زیب ایک جابر حکمران، ایک بدکردار شخص اور ہوسِ اقتدار میں اندھا ہو جانے والا فرد ہے؛ یا یہ کہ اس نے حفاظت خود اختیاری کے تحت سب کچھ کیا، اور بدرجہٗ آخر یہ کہ وہ ہندستان نامی ہندو سمندر میں مسلمانوں کا تشخص بحال رکھنا چاہتا تھا۔

۱۔ پہلے مفروضے کے حق میں کوئی ایسی تاریخی شہادت نہیں ملتی، جو اسے مجرم ثابت کر سکے۔

۲۔ دوسرے مفروضے کو تقویت دینے والا لوازمہ موجود ہے کہ خود حفاظتی کا محرک جذبہ بڑی حد تک کام کر رہا تھا؟

۳۔ تیسرے مفروضے کے دلائل بھی بے حد مضبوط ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے اندیشے کہ مسلم تشخص کو بحال رکھنا ہے، اُس کی ساری زندگی سے عیاں ہے۔ مجدّدی تحریک کے ساتھ اُس کی دلی وابستگی اور تختِ شاہی پر بیٹھنے کے بعد اسلامی شریعت کے اجرا کے لئے اس کی تگ و دو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

بظاہر دوسرے اور تیسرے مفروضے میں ٹکراؤ محسوس ہوتا ہے، لیکن گہرا جائزہ لیں تو یہ اختلاف اور ٹکراؤ ختم ہو جاتا ہے۔ ذیل کی وضاحت سے یہ بات سامنے آ جائے گی:

اسلام میں بقائے زندگی مقاصد شریعت میں سے ہے۔ جان اہم اور قیمتی ہے، جسے بچانا لازم ہے۔ اورنگ زیب کے لیے سب سے پہلے اپنی جان کو لاحق خطرات سے نمٹنا ضروری تھا، جو بھائیوں اور باپ کی طرف سے اُسے لاحق تھے۔ اس کے بغیر وہ اسلام کی خدمت بھی نہ کر پاتا۔ اس کے بڑے بھائی دارا شکوہ کو اصل نفرت اورنگ زیب کے دینی جذبے سے تھی۔ دارا نے جب اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا تو پھر اورنگ زیب اُس کی نظر میں صرف ایک باغی تھا۔

آخری دونوں مفروضے اتنے معقول ہیں کہ کسی رنگ آمیزی اور قینچی چلانے سے بھی ان کا بطلان نہیں ہو سکتا۔

ایک سوال جو قاری کا پیچھا نہیں چھوڑتا، یہ ہے کہ برنیئے جیسے مؤرخ، اورنگ زیب کے افعال میں خرابیاں اور خامیاں ہی کیوں دیکھ رہے ہیں۔ وہ سارے بُرے ارادے اُسی کی طرف کیوں منسوب کر دیتے ہیں۔ انہیں اورنگ زیب کا دینی میلان یاد نہیں رہتا۔ اس کا صاف کردار بھی وہ نہیں دیکھ پاتے، بلکہ اُسے ''فریب دہی کا لب لباب'' سمجھتے ہیں۔ ہم برنیئے کی عیسائیت کا ذکر پہلے بھی کر چکے ہیں اور یہ بھی کہ وہ اسلام سے کتنی نفرت کرتا تھا اور جو شخص اسلام کے دفاع میں کھڑا تھا وہ اُسے کتنا بُرا لگ رہا تھا۔

ایک دوسری وجہ قابلِ غور ہے۔ یہ بھی برنیئے کی عیسائیت ہی ہے، لیکن ذرا مختلف انداز میں۔ سینٹ پال م: ۶۷ء کی عیسائیت میں: مذہب کو دنیا سے رغبت نہیں ہونی چاہیے اور اقتدار کی ہر شکل سے اُسے دور رہنا چاہیے۔ جو کچھ آسمانی (ربّانی) ہے، اسے شیطانی دنیا سے بے تعلق ہونا چاہیے۔ مذہب اور زندگی کا یہ دوئی پسند تصور اپنے ہی پیمانے ایجاد کر دیتا ہے۔ پھر افراد اور ان کے اعمال اسی پیمانے پر جانچے جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں مذہب پر کاربند

ہے اور پھر بھی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ حضرات اسے فریب کا الزام دیتے ہیں کہ دنیا کی رغبت دیکھ کر تقویٰ باقی نہیں بچتا۔ یہ کردار ان کی نظروں میں مشتبہ ہے۔

جب برنیئے الزام لگاتا ہے کہ اورنگ زیب کی مذہبیت ''دکھاوا تھی، جو در اصل اس کے اندر نہ تھی'' اور یہ کہ اس کی زندگی ''مستقلاً سازشوں اور جعل واختراع'' سے عبارت تھی، تو ساری بات سمجھ آجاتی ہے۔ اس کے خیال میں اورنگ زیب محض نمائشی انسان ہے، کوئی مخلص بندہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برنیئر ہو یا اسلام کے متعلق مغرب کے مطالعہ کنندگان کا پورا جتھہ، محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کی تکذیب کرتا ہے۔ آنحضورؐ کے بلند وارفع مقام کے مقابلے میں تو اورنگ زیب ایک حقیر اُمتی ہے۔ برنیئے اور اس کے دوسرے دوست اس بے چارے کے ساتھ کیا انصاف کریں گے۔

اورنگ زیب کا اصل جرم

اورنگ زیب کا اصل جرم کچھ اور ہے، جس کے لئے ہر ڈھنگ کے سیکولر عناصر، خواہ وہ ہندو ہوں، مغربی مؤرخین ہوں یا نام نہاد مسلمان پاکستانی سیکولر، اُسے کبھی نہیں بخشیں گے۔ اس نے ہندو دلدل میں پھنسے مسلمانوں کا تشخص بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ ہندو تو خاص طور پر آتش زیر پا ہیں کہ اورنگ زیب نے اُن کی فتح کی اُمیدوں پر اس وقت پانی پھیر دیا کہ ''دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام'' رہ گئے تھے۔ عیسائی مؤرخ اس لیے آگ بگولا ہیں کہ تختِ دہلی پر عیسائیت کی حکمرانی کے خواب اس نے بکھیر کر رکھ دیے۔

اگر مسلمانوں پر اکبر اور دارا شکوہ کی طرح کے چند اور حکمران حکومت کر لیتے تو صحیح تر الفاظ میں نہ

آج پاکستان نام کی کسی مملکت کا وجود ہوتا، نہ اسلام کی سربلندی یا سیکولرزم کی مخالفت کے نعرے گونج رہے ہوتے۔

ایک علامت کے طور پر ہمارے جذبات واحساسات پر اورنگ زیب کی گرفت بہت مضبوط ہے، کیونکہ اس نے مسلم شعور کو حیاتِ تازہ بخشی، ہماری لڑکھڑائی قومی شخصیت کو سہارا دیا اور خطرے کو بھانپنے کی ہماری سوچ کو بیداری اور توانائی بخشی۔ اس نے ہمیں یہ بھی سمجھا دیا کہ جب خونیں رشتے بھی اسلام کے خلاف صف آراء ہو جائیں تو ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ عالمگیر کو آزادروی پر مبنی کفر کی حقیقی فطرت کا بہ خوبی اندازہ تھا۔ یہ اُسی نے ہمیں سمجھا دیا کہ مذہبی معاملات میں بگ ٹٹ آزادروی محض ایک نظریہ یا فلسفہ نہیں، یہ تو قوت اور اختیار کی ڈاکٹرائن (doctrine) ہے جو حکومت پر قبضے سے کم پر راضی نہیں ہوتی۔ یا تو آپ اسے سینگوں سے پکڑیں ورنہ یہ خود آپ کو اُدھیڑ کر ختم کر دے گی۔ بہ ایں ہمہ سیکولر اندازوں کے مطابق اورنگ زیب کو رگیدتے رہنا بہت ضروری ہے، ورنہ وہ اپنے کردار سے لوگوں کو بتاتا رہے گا کہ آج اس اکیسویں صدی میں بھی اصل مسئلہ کیا ہے۔

مزید براں اورنگ زیب محض بادشاہ نہ تھا، وہ ایک نجات دہندہ تھا، ایک دُوراندیش انسان تھا، جسے اپنا عظیم ومقدس کردار صاف نظر آرہا تھا۔ اپنے عہد کے منظرنامے پر اس نے اپنا کردار کمال خوبی اور حوصلہ مندی سے ادا کیا۔ فی الوقع اس نے مسلمانوں کو شک، تذبذب اور خوف کی بے سکون کیفیت سے نکالا۔ انہیں یقین وایمان اور ولولۂ تازہ دیا، جس نے انہیں اپنی نظروں میں باوقار بنا دیا۔ آج چار صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس کے مخالفین کی زہریلی پھنکاریں ثابت کرتی ہیں کہ اپنے وقت کی نیام میں وہ اسلام کی بہترین تلوار تھی۔ اقبال نے کیا خوب کہا:

پایۂ اسلامیاں برتر ازوں
احترامِ شرع پیغمبرؐ ازوں

مسلمان ان کی کوششوں کے نتیجہ میں دنیا میں بہتر مقام پر ہیں۔ رسول اللہؐ کی شریعت کا احترام انھی کے رہینِ منت ہے۔

1 'Ali ibn al-Husayn al-Mas'udi, *Murruj al-Dhahab wa Mahadin al-Jauwahir,* section 989.

2 Dr. Muhammad *Iqbāl, Isrār-i Khudi.*

3 Michel Foucault, *The Archeology of Knowledge*, trans. A.M. Sheridan Smith (New York: Harper Colphon, 1972, p. 7, cited by Herbert Dreyfus and Paul Rabinbow, *Beyond Structuralism and Hermeneutics* (Chicago: The University of Chicago Press, 1983) p. 51.

For an excellent exposition of Michel Foucault' thought, this is must read.

4 For the Archibald Constable's note, see François Bernier, *Travels in the Mogul Empire* 1656-1668 (New Delhi: Asian Educational Services, 2004) p. 7. fn 1

5 Bernier, *Travels* ... p. 291.

6 Ibid., p. 288

7 Ibid., p. 288, fn 1

8 Ibid., p. 291.

9 Ibid., p. 292.

10 Ibid., p. 291.

11 Ibid., p. 10.

12 Ibid., p. 10.

13 Ibid., p. 10.

14 Ibid., p. 11.

15 Ibid., for the quote from Catou, see fn 1, p. 11.

16 Sayyid Najīb Ashraf Nadvi, (ed)., *Ruq'āt 'Ālamagīr*, (Azamgarh: Dar al-Musannafin, 1927) ruqa' 1/197, p. 311. This is Jahān Āra's letter to Aurangzeb.

17 Jean Baptiste Tavernier, Travels in India, edited by William Crooke (Delhi: Low Price Publications, 2000) p. 274.

18 For Prof Charles Joret's comment from his biography of Tavernier, see Tavernier, *Travels* ..., p. xxvi, "introduction."

19 For H.A.Rose's comment, see p. xliv under "some additional notes on Tavernier's history and geography."

20 Ibid.

21 Ibid., ivii

22 Shāhjahān had great qualities of heart and mind. Also established is his great love for his children. But as Dārā's love began to absorb him, he lost his balance. Increasing age made him a different person. Gradually, he became suspicious of Aurangzeb's intentions. One time, Aurangzeb wounded his finger. Writing with a bandage finger was inconvenient but since he had to respond to his father's letter, he wrote it. When his father received his letter, the handwriting had an obvious slant. Shāhjahān flared up or probably Dārā Shikoh made him believe that instead of Aurangzeb writing himself, somebody else wrote it, which shows Aurangzeb's arrogance and insolence towards his father. See ruqa' 10/96, p. 171.

23 *Ruq'āt 'Alamgīr, ruqa'* 27/159. pp. 250-251.

24 Ibid.

25 About this event chronicled Mirzā Muhammad Kāzim Shirāzi, *'Ālam-gīrnāma* (Murādabād: Kutab Khāna Qāzi Taslim Husain), see Sayyid Miān Muhammad, *'Ulamā-i Hind kā shandār māzi* (Lahore: Maktaba Muhammadia Sāqi Must'ad Khān, Ma'āsir-i 'Ālamgīri (Lahore: Suhail Academy, 1981) p. 317.

26 Sāqi Must'ad Khān, *Ma'āsir-i 'Ālamgīri* (Lahore: Suhail Academy, 1981) p. 317.

27 For this quote from Ināyatullāh Khān, *Ahkām 'Ālamgīri*, see Sayyid Miān Muhammad, *'Ulamā-i Hind*...p. 455. Ināyatullāh Khān was Aurangzeb's secretary.

28 Aurangzeb considered fighting Dārā Shikoh as his obligation toward Muslims and Islam. "Since the power shift had already occurred during your Majesty's illness to the Prince, who had no Islamic imprint to his character and had begun consolidating to his advantage the military power, assuming all the trappings of kingship and spreading disbelief and atheism, it had become obligatory on me religiously, rationally, and even according to the usage, to face him. For this obligation, I made the move [towards Agra]. Before, I had to fight with the infidels, who were replacing masājid with idol-worshipping temples, followed with my charge against the secularists and atheists. As my intention was not soiled with selfishness, I succeeded in vanquishing them even with a small number of troops and my body remained free from injury." (translation mine). See Ruq'āt ..., *ruqa'* 7/130,, p. 223.

29 Bernier, *Travels* ..., p. 287, fn1. This is Archibald Constable's

footnote from Catou's *History*...

30 Dara's letter is preserved in *Ruq'āt 'Ālamgīr*; ruqa' 2/211, p. 330 and reads as follows: "To this humble person, intuitional responses [and ecstasies] that do not accord with Allah's commandments and His prophets' are far better than what is within the books ... I have given up their reading and devoted myself to the study of my heart, which is a limitless ocean...."

31 *Ruq'āt 'Ālamgīr; ruqa'* 4/119 B., p. 204.

32 For this quote from Dārā, see Zahirruddin Fārūqi, *Aurangzeb and his Times* (Delhi: Idārāh Adhiyāt, 1972) p.50.

33 *Ruq'āt 'Ālamgīr*; ruqa' 4/119, pp. 198-205.

34 *Ruq'āt 'Ālamgīr* ..., ruqa' 8/235, p. 357

35 Aurangzeb's letter is self-explanatory: "The prince Dārā Shikoh has arrived in Dholpur. It is beyond his ability to win against a battle-tested commander like me. It will be prudent if he considers his elderly status and withholds his intention of warring against me and go to his dominion Punjab while giving me the chance to serve your Majesty for a few days." See ruqa '4/119-A, p. 200. (translation mine)

36 *Ruq'āt 'Ālamgīr*; ruqa' 6/121, p. 207.

37 *Ruq'āt 'Ālamgīr*; ruqa' 3/ 198-B, p.300.

38 *Bernier, Travels* ..., p. 65.

39 *Ruq'āt 'Ālamgīr*; ruqa' 1/186, 295.

40 *Ruq'āt 'Ālamgīr*; ruqa' 1/186, 295.

41 *Ruq.'āt 'Ālamgīr*; ruqa' 1/196., p. 309-310. The letter reads:

My Dārā Shikoh is about to reach Lahore. There is no shortage of money in Lahore while Kabul has no dearth of manpower and horses. It will be better if the brave commander reaches Lahore soon and while conjoining with Dārā punishes these two disobedient sons so that the imprisoned Sāhib-i Qur'ān get his freedom. (translation mine).

42 Bernier, *Travels* ... p. 65.

43 For this letter from Adab 367-a, see Zahiruddin Fārūqi, *Aurangzeb and His Times* (Delhi: Idārāh-i Adabiyāt, 1972) p. 65. I have made some changes in Faruki's translation.

44 Dr. Muhammad Iqbāl, *Isrār-i Khūdi*

45 *Ruq'āt 'Ālamgīr,* ruqa' 1/124, p. 212. See under the heading ba'd az 'uzlat-i Shāhjahān talāfi māfāt.

46 Ibid.

47 Bernier, *Travels*... p. 166.

48 Ibid.

49 *Ruq'āt 'Ālamgīr,* ruqa' 2/195, p. 308.

50 Bernier, *Travels* ..., p. 125. He willed for his father's release, as his death would take him out of the harm way from Shājahān

51 Bernier, *Travels* ..., p. 167

52 Ibid., pp. 167-168

53 Bernier, *Travels* ... p. 100. Khāfi Khan also suggests that Dārā had his execution "under a legal opinion of the lawyers, because he had apostatized from the law, had vilified religion and had allied himself with heresy and infidelity." For Khafi Khan's quote, see Bernier, p.100, fn 1. Before Dārā's death, Aurangzeb questioned his brother through someone. "What would you have done to the Emperor had he fallen into your hands as you have fallen into his?" "He is a rebel and a parricide," said Dārā, "let him judge of the treatment he has merited by reflecting upon his crimes and such deserts he would have received with the utmost rigour at my hands." p. 102, fn 1. If this dialogue is true, there was no forgiveness from Dārā's, either.

54 His books included *Safina al-Auliyā', Sakina al-Auliyā', Risāla Haq-numā, Hasanat al-Ar'āfin, Majma' al-Bahrayn, Maqalama Dārā Shikoh wa Baba Lal, Minhaj al-Sālakīn.* The last two were coauthored. In case of the *Maqalama*, the coauthor's name is Munshi Chander Bhan. For the list of these books, see Sayyid Muhammad Mian's *Ulamā-i Hind kā shandār māzī* (Lahore: Maktaba Mahmudiya, 1977) p. 302.

55 Two instances will be enough to show the close relationship they had developed. It is reported that when Aurangzeb was the governor of Multan, he would often visit Khawāja Ma'sūm. On such occasions, he had no special privileges. He would sit on the floor among the commoners like the rest. In this relationship, Aurangzeb was on the receiving end. Overawed by Ma'sūm's presence, he would not utter a word out of respect, sitting all the time with his

head slanted downward. If he had to ask anything, he would write it down for Ma'sūm to read.

When Ma'sūm started his journey for hajj, thousands of people thronged him on his route to Makkah. Aurangzeb was one of them. He presented him with 12,000 āshrafis, which Ma'sūm accepted contrary to his practice. He gave him the glad tiding of kingship in the near future. Aurangzeb asked him to write down the proclamation in his favour, which he did. Later, Aurangzeb younger sister Gauhar Āra would laughingly say that his brother bought this kingdom for the paltry sum of 12,000 āshrafis.

The other incident shows their closeness. Aurangzeb was then campaigning in Balkh. Young and determined, he could do even the impossible. Ma'sūm wants to harness his youth in the service of Islam. Ma'sūm's occasional letter is a masterpiece of rhetoric as well as rich in spirituality and persuasion. Urging him to restrain his youthful self and surrender himself to Allah for it is in surrender that a believer is exalted. He asks him, among others, to be firm in Islam:

"[I]t is obligatory for the one who is wise to reflect on the life spent so far and the goals he has opted for himself. He who attains this kind of wealth deserves to be congratulated; for him are all the applause. Let him have the glad tiding that he has found the justification for his birth and has qualified himself for Allah's mercy and beneficence. And if he has not succeeded so far, then he must continue his effort to realize it..." (translation mine).

56 For Constable's note see Bernier, *Travels* ... p. 101, fn 1.

57 Bernier, *Travels*...pp. 103.

58 Ibid.

59 *Ruq'āt 'Alamgīr*, ruqa' 4/ 170, p. 264.

60 For Khāfi Khān's quote see Sayyid Muhammad Mian, *'Ulamā-i Hind*... p. 521.

61 Bernier, *Travels* ..., pp. 27, 33.

62 *Ruq'āt 'Ālamgīr*, ruqa' 4/ 170, p. 264.

63 Stanley Lane-Poole, *Mediaeval India under Muhammadan Rule* (Lahore: Sang-i Meel Publications, 2007) p. 351.

64 Iqbal, *Isrār*...